بسم اللہ الرحمن الرحیم

اقلیم ولایت و امامت کے ساتویں تاجدار
حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام
کے فرامین، ھدایات اور ارشادات

از :

سید محمد تقی حکیم

ترجمہ:

سید سجاد حسین ہمدانی

(0345-5205984/0300-5205984)

ڈھوک لکھن، چکری روڈ راولپنڈی

تعارف کتاب

نام کتاب : اقلیم ولایت وامامت کے ساتویں تاجدار حضرت امام موسیٰ کاظم کے فرامین، ہدایات اور ارشادات (ترجمہ سخنان حضرت موسیٰ بن جعفرؑ)

مؤلف : سیّد محمد تقی حکیم

مترجم : سیّد سجاد حسین ہمدانی

اہتمام وتطبیق : محمد لقمان ڈار

کمپوزنگ وصفحہ بندی : شاہد علی (0333-5277426, 051-4319883)

ناشر :

تاریخ اشاعت :

تعداد : ۱۰۰۰

قیمت :

......☆......☆......☆......☆......☆......

ایران میں اصل فارسی کتاب طبع سوم ملنے کا پتے:

فروشگاه مرکزی: خیابان فردوسی، رو به روی فروشگاه شهر و روستا۔ ٹیلیفون: [illegible]

فروشگاه شماره یك: میدان انقلاب، بازار چه کتاب۔ ٹیلیفون: [illegible]

فروشگاه شماره دو: میدان انقلاب، خیابان [illegible] آذر۔ ٹیلیفون: [illegible]

فروشگاه شماره سه۔ قم، خیابان ارم، سه راه موزه۔ ٹیلیفون: [illegible]

فروشگاه شماره چهار: شمیران، میدان قدس، کوچه شهید علی حدّادی، جنب مسجد اعظم۔ ٹیلیفون: [illegible]۔[illegible]

دایره پخش: [illegible]

نمایشگاه قرآن: خیابان شریعتی، پشت حسینیه ارشاد، خیابان شهید ناطق نوری۔ ٹیلیفون: [illegible]

....

http://www.islamcpo.com

info@islamcpo.com

عرض مترجم

تمام قارئین کرام سے التماس ہے کہ وہ میرے اور لقمان ڈار کے مرحومین کے ایصال ثواب کے لئے سورۂ فاتحہ، سورۂ توحید اور معوذتین کی تلاوت فرما کر دُعائے مغفرت فرمائیں۔

انتساب

ان نوجوانوں کے نام جو اپنی زندگیوں کو سیرتِ آل محمدؑ کے مطابق بسر کر کے امام مہدیؑ کے عالمی انقلاب کے لئے علمی جدو جہد کرنے والوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔

سجاد ہمدانی

پیش لفظ

یہ کتاب من جملہ ان کتب میں سے ایک ہے جو بتدریج پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اطہار علیہم السلام کے الہامی کلام کی تفسیر و تشریح پہ مبنی میں نے تالیف کی ہے۔ یہ اس سلسلے کا نواں شمارہ ہے۔ ایک شمارہ حضرت علی علیہ السلام کے الہامی ارشادات پہ مبنی ہے جو کتاب کی شکل میں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے اور ساتواں شمارہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے قیمتی فرامین پہ مبنی تھا یہ بھی چھپ کر منظر عام پر آچکی ہے۔

مذکورہ کتاب ۱۳۴۱ھ ق میں حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ایک ۱۰۰ قیمتی فرامین پہ مشتمل ہے جو ایک مختصر سے مقدمے کے ساتھ تالیف ہوئی ہے اور ۱۳۴۲ میں پہلی مرتبہ زیور طبع سے مزین ہو کر کتابفروشی عالم شاہ دزفولی تہران کے ذریعہ شائع ہوئی۔ مگر طبع ثانی میں آپؑ کے حالاتِ زندگی، اخلاق، فرامین اور مختصر سے تعارف کا اضافہ کیا گیا اور آپؑ کے ہر فرمان کو ایک علیحدہ صفحہ پر ایک مستقل عنوان کے تحت شائع کیا گیا اور اب کی بار دار التبلیغ اسلامی قم سے ۱۳۵۱ میں چھپی، جبکہ طبع سوئم ایک بار پھر تہران سے طبع دوم ہی کے مطابق ۱۳۶۱ھ ق میں مؤلف کے توسط سے چھپ کر منظر عام پر آئی۔ طبع چہارم اپنی تمام تر تبدیلیوں کے ساتھ موجودہ ترتیب میں اس طرح کہ ہر فرمان سے قبل مختصری مگر مناسب تشریح و تفسیر پھر فرمان اور آخر میں ترجمہ دیا گیا ہے۔

البتہ اس کے مقدمے میں آپؑ کی صفات و خصوصیات اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو جامع انداز میں اضافے کے ساتھ پیش کیا گیا۔

کتاب کے مدارک

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ہر فرمان کا حوالہ صفحے کے اختتام پہ حاشیہ کے نیچے درج کر دیا گیا۔ اگر اس صفحہ پہ کسی آیت حدیث یا کسی دوسرے مطلب سے استفادہ کیا گیا ہے تو اس کا حوالہ بھی باقاعدگی سے درج کر دیا گیا ہے۔ اس صفحے کے حاشیہ پہ مکمل حوالہ درج ہو۔

مدارک کی تفصیل

(۱) المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم: مؤلف محمد فواد عبد الباقی جو ۱۳۶۴ھ ق میں بیروت سے چھپی اس میں ہر سورۂ اور آیت کا نمبر اور حوالہ درج ہے۔

(۲) تفسیر مجمع البیان: مؤلف شیخ طبرسی ہیں۔ کتابفروشی اسلامیہ تہران سے ۱۳۷۳ھ ق سے منظر عام پر آئی۔

(۳) نہج البلاغہ: جس کی تحقیق، الفاظ کے معانی علم فہرست جناب ڈاکٹر صبحی الصالح کے ذریعے انجام پائی ہے۔ طبع اوّل بیروت سے ۱۳۸۷ھ ق میں انجام پائی۔

(۴) اصول کافی: شیخ کلینی، دار الکتب الاسلامیہ طبع سوئم تہران سے ۱۳۸۸ھ ق میں چھپی۔

(۵) تحف العقول: مؤلف حسن بن علی بن الحسین بن شعبہ حرانی، تہران میں ۱۳۷۶ھ ق میں مکتبہ الصدوقؒ کے ذریعے چھپ کر منظر عام پر آئی۔

(۶) بحار الانوار: علامہ محمد باقر مجلسیؒ: ۱۴۰۳ھ ق بیروت میں طبع ہوئی۔

(۷) سفینۃ البحار: حاج شیخ عباس قمی، ناشر: کتابخانہ سنائی تہران، البتہ سن طبع معلوم نہیں۔

(۸) ارشاد: مؤلف شیخ مفیدؒ، ناشر: دارالکتب الاسلامیہ، تہران ۱۳۷۷ھ ق۔

(۹) مناقب آل ابی طالبؑ: مؤلف ابن شہر آشوبؒ، ناشر: المکتبہ و المطبعة الحیدریہ نجف، تاریخ ۱۳۷۶ھ ق۔

(۱۰) المحجۃ البیضاء: مؤلف ملامحسن فیض کاشانی، مکتبہ الصدوقؒ تہران ۱۳۴۰ھ ق۔

(۱۱) اختیار معرفۃ الرجال (المعروف بہ رجال کشی): مؤلف شیخ الطائفہ، شیخ طوسیؒ (قدس سرہ) ناشر دانشگاہ مشہد المقدس ۱۳۴۸ھ ش۔

(۱۲) جامع السعادات: مؤلف حاج ملامہدی نراقی، تصحیح اور تعلیق جناب سید محمد کلانتر، نجف اشرف، تاریخ ۱۳۸۳ھ ق۔

(۱۳) روضات الجنات (آٹھ جلدی): مؤلف میرزا محمد باقر موسوی خوانساری اصفہانی، ناشر کتابخانہ اسماعیلیان، جلد اوّل اور دوئم تہران سے ۱۳۹۰ھ ق میں چھپیں اور باقی چھ جلدیں قم سے ۱۳۹۱ھ ق میں طبع ہوئی ہیں۔

(۱۴) میزان المقادیر: مؤلف علامہ ملامحمد باقر مجلسیؒ بمبئی ۱۳۰۸ھ ق۔

مقدمہ

ہمارے ساتویں پیشوا امام موسیٰ کاظمؑ

آپؑ کی چمکتی پیشانی، کشادہ کاندھے، کندھوں تک پھیلی ہوئی سیاہ زلفیں تھیں (مناقب ج:۴ص:۳۲۷) آپ کی پہچان اور طرہ امتیاز ہاتھ کھلا (سخاوت) وحی الٰہی میں ڈھلی ہوئی شائستہ زبان (مناقب ج:۴ص:۳۲۷) ہر وقت عبادت خدا میں کوشاں رہنا شامل ہے۔ آپؑ نماز تہجد کے پابند اور شب زندہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ خداوند کریم سے طویل راز و نیاز کا سلسلہ قائم رکھے ہوئے تھے۔ آپؑ کے سجدے طولانی ہوتے، عشق خدا کے سبب اشکوں کا سیل رواں رہتا۔ ہمیشہ استغفار کرتے نظر آتے۔ دعا کرنا گویا آپ کی عادت ٹھہری اور آپؑ فرمایا کرتے تھے:

''اے پروردگار! موت کی گھڑیاں مجھ پر آسان فرما۔ حساب کے موقع پر عفو فرما اے میرے رب تیرے بندہ کے گناہ بہت بڑے ہیں مگر تیری بخشش و عفو اس سے بھی کہیں عظیم تر ہے''۔ (ارشاد ص:۲۷۹ تا ۲۷۷)

آپؑ ساری مخلوق میں احکام خدا کے علم کے سلسلے میں اعلم ترین درجے پہ فائز تھے۔ تلاوت قرآن حکیم میں سب سے آگے تھے۔ آیات الٰہی کی حفاظت و نگہداری میں سب سے زیادہ حساس تھے۔ اور بڑے دلنشین لہجے میں تلاوت قرآن فرمایا کرتے تھے۔ دوران تلاوت خود گریہ بھی فرماتے اور بڑا گہرا اثر خود بھی لیتے اور سننے والوں کو بھی رُلاتے تھے۔ (ارشاد ۲۷۹ تا ۲۷۷) آپ صبر و بردبار طبیعت کے مالک بزرگ تھے۔ خطا کاروں کو فوراً معاف کر دیا کرتے تھے۔ جو برائی کرتا اس کے ساتھ ہمیشہ نیکی کرتے تھے۔ (المحجۃ البیضاء ج:۴ص:۲۶۶)۔ اپنے خاندان کے ساتھ بہت زیادہ شفقت سے پیش آتے اور اپنے رشتہ داروں سے گہری محبت رکھتے تھے۔ فقراء کی سرپرستی فرماتے، رات کی تاریکی میں انہیں نقدی، آٹا، کھجوریں اور روٹیاں پہنچاتے جبکہ وہ آپؑ کو دیکھ نہیں پاتے (پہچان نہیں پاتے تھے) کہ یہ محبت اور لطف کس کی طرف سے ہو رہا ہے۔ (ارشاد ص:۲۷۷)

یہ ہے ہمارے ساتویں امامؑ کی ایک جھلک

آپؑ کا اسم گرامی اور اوصاف

آپؑ کا اسم گرامی موسیٰ، مشہور کنیت ابوالحسن اور ابوابراہیم تھی۔ اور مشہور لقب کاظم تھا۔ (مناقب ج:۴ص:۳۲۷)۔ آپؑ کے والد گرامی امام ششم حضرت امام صادق علیہ السلام تھے۔ جبکہ آپؑ کی والدہ گرامی کا اسم نامی حمیدہ خاتون تھا۔ (مناقب ج:۴:ص:۳۲۷)۔ آپؑ کی ولادت با سعادت ۷ صفر ۱۲۸ھ ق ابواء (مکے اور مدینے کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے) میں ہوئی۔ آپؑ نے ۱۹ یا ۲۰ سال اپنے والد بزرگوار کے زیر سایہ بسر کئے۔ ان کی شہادت کے بعد آپ کے قائم مقام اور جانشین قرار پائے۔ آپ کی مدت امامت پینتیس برس پہ محیط ہے۔ (مناقب ج:۴،ص:۳۲۸ تا ۳۲۷)۔ آپؑ کے عصر مبارک میں خلفاء بنی عباس کے بادشاہ منصور، مہدی، ہادی اور ہارون الرشید عباسی ہو گزرے ہیں۔ (مناقب ج:۴ص:۳۲۸ تا ۳۲۷)۔ آپؑ کو ہارون الرشید کی حکومت کے

پندرہویں سال سندی بن شاہک کے زندان میں زہر دیا گیا اور یوں پچیس ۲۵ رجب المرجب ۱۸۳ ھ ق آپؑ درجہ شہادت پہ فائز ہوئے۔(مناقب ج:۳، ص:۴۳۸۔۴۳۷)

آپؑ کے جسد اطہر کو بغداد کے مغربی علاقے میں جہاں قریش کی قبریں موجود تھیں یہ جگہ مقابر قریش کے نام سے مشہور تھی دفن کیا گیا۔(مناقب ج:۳ص:۴۳۸۔۴۳۷)۔آپؑ کے پہلو میں امام نہم حضرت امام محمد تقی ؑ کا پیکر مطہر دفن ہے۔(مناقب ج:۳،ص:۴۸۶)۔آج کل ان دو ہستیوں کا مدفن (حرم مطہر) کاظمین کے نام سے مشہور ہے جو اہل ایمان کی زیارتگاہ ہے جہاں سے ہر لمحے معنوی اور رُوحانی فیض کا سلسلہ دم بہ دم جاری و ساری ہے۔

آپؑ کی اولاد

بعض کتب تاریخ میں درج ہے کہ آپؑ کی سینتیس (۳۷) اولادیں تھیں۔جن میں اٹھارہ بیٹے اور انیس بیٹیاں تحریر کی گئی ہیں (مناقب ج:۳ ص:۴۳۸)۔ان میں سے بعض ایران میں بھی دفن ہیں جن میں مشہور:

(۱) حضرت امام رضا ؑ شیعان جہاں کے آٹھویں امام ہیں اور مشہد مقدس میں ہی آپؑ کا حرم مطہر ہے۔(ارشاد القلوب ص:۴۸۵)

(۲) حضرت فاطمہ معصومہ سلام اللہ علیہا قم المقدسہ میں دفن ہیں (سفینۃ ج:۲،ص:۳۷۶)

(۳) احمد بن موسیٰ جو شاہ چراغ کے نام سے مشہور ہیں شیراز میں دفن ہیں۔(سفینۃ ج:۱،ص:۳۰۵)

(۴) محمد بن موسیٰ جو محمد عابد کے نام سے مشہور ہیں جناب شاہ چراغ کی قبر مطہر کے نزدیک دفن ہیں۔(روضات الجنات ج:۱ص:۴۴)

(۵) حمزہ بن موسیٰ شہر رے میں دفن ہیں ان کی مرقد مطہر حضرت شاہ عبدالعظیم کے حرم مطہر کے احاطے میں واقع ہے۔(روضات الجنات ج:۴ ص:۲۱۲)

آپؑ کی سفارش

اسی شہر کا ایک شخص نقل کرتا ہے کہ یحیٰ بن خالد برمکی ہمارے حاکم مقرر ہوئے۔میرے ذمے کچھ ٹیکسز بقایا تھے جو میں نے نہیں ادا کئے تھے اور اگر میں سارے ٹیکس ادا کر دیتا تو میرے پاس اپنی گزراوقات کیلئے کچھ نہیں بچتا تھا۔نئے حاکم کے تقرر اور شہر میں آجانے سے میں خوف زدہ ہوگیا کہ اب مجھے ٹیکسوں کی ادائیگی پہ مجبور کیا جائے گا جبکہ ادائیگی میرے لئے ممکن نہیں ہے۔مجھے چند دوستوں نے بتایا کہ نیا حاکم شیعہ ہے اور اہل بیت علیہم السلام کے عقیدت مندوں میں سے ہے مگر مجھے پھر بھی اس کے قریب جانے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔مجھے ڈر تھا کہ وہ مجھے قید کر کے اذیت دے گا اور مجھ سے ٹیکس کا مطالبہ کرے گا۔میں اپنے رب پہ توکل کر کے اپنے امام زمان حضرت موسیٰ ابن جعفر کی خدمت میں حاضر ہوگیا اور پورا ماجرا آپؑ کی خدمت میں پیش کیا تا کہ اس سلسلے میں آپؑ میری مشکل کشائی اور مدد کر سکیں۔حج کے سفر پر روانہ ہوگیا اور یوں مدینے میں آپؑ کی خدمت میں جا پہنچا۔اپنا حال اور پریشانی آپؑ کی خدمت میں پیش کی اور آپؑ سے امداد طلب کی، آپؑ نے حاکم کے نام خط لکھ کر مجھے دیا تا کہ میں بذات خود حاکم تک پہنچاؤں۔

خط کا متن یہ تھا:

﴿بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اِعْلَمْ اَنَّ لِلّٰهِ تَحْتَ عَرْشِهٖ ظِلًّا لَا يَسْكُنُهٗ اِلَّا مَنْ اَسْدىٰ اِلٰى اَخِيْهِ مَعْرُوْفًا اَوْ نَفَّسَ عَنْهُ كُرْبَةً اَوْ اَدْخَلَ عَلٰى قَلْبِهٖ سُرُوْرًا وَ هٰذَا اَخُوْكَ وَالسَّلَام! ﴾

’’مہربان و بخشنے والے رب کے نام سے! جان لو کہ خداوند کریم کے عرش کے نیچے رحمت کا ایک سایہ صرف ان افراد کیلئے ہے جو اپنے مؤمن بھائیوں کے ساتھ نیکی اور احسان کرتے ہیں یا ان کا غم اور پریشانی دُور کرتے ہیں یا ان کے دلوں میں خوشیاں دیتے ہیں۔انہیں اس سایہ میں جگہ نصیب ہوگی اور اس سے مستفید ہوسکیں گے یہ (حامل خط) تیرا بھائی ہے، والسلام!‘‘۔

میں جب حج سے واپس پلٹا تو ایک رات حاکم کی رہائش گاہ پہ جا پہنچا اور ملاقات کا تقاضا کیا اور ساتھ ہی عرض کی کہ ’’حاکم سے کہو حضرت صابر (امام موسیٰ کاظم ؑ) کی طرف سے ایک بندہ تیرے لئے پیغام لایا ہے‘‘ جیسے ہی حاکم تک یہ خبر پہنچی وہ خوش خوش ننگے پاؤں دروازے تک بھاگ کر آیا، خود دروازہ

کھولا اور مجھ سے بغل گیر ہوا اور میری پیشانی پہ مسلسل بوسے دینے لگا۔ مجھ سے امام علیہ السلام کا احوال بار بار پوچھنے لگا، میں جیسے جیسے آپ کی سلامتی کی خبر سناتا وہ خوش سے خوش تر ہوتا چلا جاتا اور خدا کا شکر بجا لاتا پھر مجھے گھر کے اندر لے گیا اور صدر مجلس کی جگہ پہ بٹھایا اور خود میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے اسے امام علیہ السلام کا خط دیا۔ حاکم خط لے کر فرط احترام سے کھڑا ہو گیا اور اسے بوسے دینے لگا پھر پڑھنا شروع کیا جب سارا خط پڑھ چکا تو اپنا سارا مال اور لباس لے آیا اور میرے اور اپنے درمیان انہیں برابر تقسیم کر دیا جو چیز تقسیم نہیں ہو رہی تھی کی قیمت مجھے ادا کی۔ ہر چیز تقسیم کرنے کے بعد کہنے لگا ''اے بھائی کیا خوش ہو گئے ہو؟'' میں نے عرض کی ''خدا کی قسم آپ نے مجھے بہت زیادہ خوش کر دیا ہے'' پھر ٹیکسوں سے متعلقہ رجسٹر منگوا کر میرا نام کاٹ دیا اور ساتھ ہی مجھے ایک خط بھی دیا جس میں تحریر تھا کہ حامل رقعہ کے ذمہ کسی قسم کی مالی ذمہ داری نہیں ہے۔ میں نے اس سے خدا حافظی کی اور اجازت لے کر اپنے گھر لوٹ آیا۔ اور میں نے اپنے آپ سے کہا اس نے تو میرے ساتھ بہت بڑی نیکی کی ہے، میں اس کے احسانات کا بدلہ ہرگز نہیں چکا سکتا لہٰذا ایک ہی صورت ہے کہ میں دوبارہ حج پہ جاؤں اور مقدس مقامات پہ اس کے لئے خصوصی دُعائیں کروں اور یوں مجھے اپنے مولاؑ کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہو جائے گا۔ آپؑ کی خدمت میں اس کے احسانات کا تذکرہ بھی کروں گا اور آپؑ سے بھی دُعا کراؤں گا۔ میں اگلے سال حج پہ گیا اپنے مولاؑ کی خدمت میں پہنچا سارا ماجرا بیان کیا۔ امام علیہ السلام جیسے جیسے سنتے جاتے خوش ہوتے جاتے۔ میں نے عرض کی ''اے میرے مولاؑ! کیا اس کے کام نے آپ کو خوش کر دیا ہے؟'' آپؑ نے فرمایا ''خدا کی قسم اس کے کام نے مجھے خوش کر دیا ہے اس نے امیر المؤمنین علیہ السلام کو خوش کیا ہے اس نے میرے نانا رسول اکرم کو خوش کیا ہے اس نے حضرت حق تعالیٰ کو خوش کیا ہے''۔ (بحارالانوار ج:۴۸ ص:۱۷۴ حدیث:۱۶)

آپؑ کا حلم

مدینے میں ایک شخص رہتا تھا جو ہمیشہ آپؑ کو تکلیف پہنچاتا تھا اور آپؑ کی شان اقدس میں نازیبا جملے کہتا تھا۔ جونہی آپؑ کو دیکھتا امیر المؤمنین علیہ السلام کی توہین کرتا۔ آپؑ کے اصحاب نے بارہا اجازت طلب کی کہ اس فاسق و فاجر کو سبق سکھائیں مگر آپؑ انہیں سختی سے منع فرماتے اور باقاعدہ ان کو روک دیتے۔ ایک دن آپؑ نے پوچھا ''یہ بدزبان مرد کہاں ہوگا؟'' جواب ملا کہ وہ (اپنے کھیتوں میں کام کاج کر رہا ہے) آپؑ اس سے ملاقات کی غرض سے چل پڑے، دیکھا کہ وہ کھیتوں میں کام کر رہا ہے۔ آپؑ اسی طرح سواری کی حالت میں اس کے کھیت میں داخل ہو گئے۔ اس نے کہا ''میری فصلوں کو مت روندو اور ادھر نہ آؤ۔ مگر آپؑ آگے بڑھتے گئے اور اس کے پاس جا پہنچے اور بڑی خندہ پیشانی اور تبسم کے ساتھ اس کی احوال پرسی کی اور پوچھا ان زمینوں پہ تو نے کتنا خرچ کیا ہے؟ اس نے کہا ۱۰۰ دینار (یہ سونے کا ایک سکہ ہے جو وزن کے لحاظ سے سونے کے ایک شرعی مثال کے برابر ہے یعنی چنے کے ۱۸ دانے۔ میزان المقادیر ص:۴) خرچ کیئے ہیں۔ آپؑ نے فرمایا ''تم جانتے ہو یہاں سے تجھے کتنی آمدن ہو گی؟ اس نے جواب دیا میں علم غیب تو نہیں جانتا۔ آپؑ نے فرمایا ''پھر بھی تمہیں کچھ تو اندازہ ہوگا کہ اس سے کتنی آمدنی ہو جاتی ہے'' اس نے کہا تقریباً دو سو دینار۔ آپ نے تھیلی نکالی اور تین سو دینار اس کو عطا کر دیئے اور فرمایا ''یہ لے لو اور تیری فصل میں سب ابھی باقی ہے، خدا اس کھیت سے تیری اُمید کے مطابق عطا فرمائے گا''۔ وہ شخص اپنی جگہ سے اُٹھا اور آپ کے سر اقدس کا بوسہ لیا اور آپؑ سے اپنی گذشتہ تمام خطاؤں کی معذرت طلب کرنے لگا۔ آپؑ نے تبسم فرمایا اور مدینے واپس آ گئے اور مسجد میں تشریف لے گئے۔ جب مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا وہ کسان مسجد میں بیٹھا ہوا ہے۔ جونہی اس کی نگاہ آپؑ پہ پڑی کہنے لگا:

﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ (سورۂ انعام آیت:۱۲۴)

''خداوند کریم سب سے زیادہ اور بہتر جانتا ہے وہ اپنی رسالت کا کام کب کہاں اور کس کے ذریعے انجام دے''۔

اس کسان کے دوست کہنے لگے کیا ہوا ماجرا کیا ہے؟ تم یہ الفاظ کہہ رہے ہو؟ میں نے جو کچھ کہا تم نے سُن لیا ہوگا اور ساتھ ہی آپؑ کے حق میں دُعا کرنے لگا۔ اس تبدیلی سے اس کسان کے دوست ناراض ہو گئے اس سے بغض و کینہ رکھنے لگے اور اس کسان نے بھی ان سے اپنی دوستی ختم کر لی۔ جب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اپنے گھر تشریف لائے تو اپنے ان اصحاب سے جو اس کسان کو سبق سکھانے پر تُلے ہوئے تھے کو مخاطب کر کے فرمایا ''تمہاری نظر میں جو کام میں نے کیا وہ کیسا تھا؟ میں نے اس کے کام کی اصلاح کر لی ہے اور اس کے شر کو دُور کر دیا ہے''۔ (ارشاد القلوب ص:۱۷۸)

امامؑ کا جھنجھوڑنا

صفوان کہتا ہے کہ میں امام موسیٰ کاظمؑ کی خدمت میں پہنچا، آپؑ نے فرمایا ''اے صفوان! تمہارے سارے کام اور صفات اچھی ہیں سوئے ایک چیز کے''۔ میں نے عرض کی ''آپ پہ قربان جاؤں وہ کیا چیز ہے؟'' آپؑ نے فرمایا ''وہ تیرا ہارون کو کرائے پہ اپنے اُونٹ دینا ہے''۔

میں نے عرض کی اُونٹ تکبر و خودنمائی، شکار اور سیر و سیاحت کیلئے نہیں دیتا ہوں بلکہ اسے صرف مکہ المکرّمہ کے سفر کیلئے کرائے پہ دیتا ہوں اور میں بذاتِ خود اس کام کی سرپرستی اور نگرانی بھی نہیں کرتا ہوں، میرے غلام جملہ امور انجام دیتے ہیں۔ امامؑ نے فرمایا ''اے صفوان! تم جب اسے اُونٹ دیتے ہو تو ان کا کرایہ اس کے پاس ہوتا ہے'' میں نے عرض کی جی ہاں۔ فرمایا ''کہ تم یہ چاہتے ہو کہ وہ محفوظ رہیں اور آ کر تجھے کرایہ ادا کرسکیں'' میں نے عرض کی جی ہاں۔ آپؑ نے فرمایا ''جو کوئی ان کی بقا چاہتا ہے گویا انہی میں سے ہے اور جو کوئی ان میں سے ہوگا اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا''۔ صفوان کہتا ہے میں نے جا کر اُونٹ فروخت کر دیئے۔ اس کی خبر جب ہارون تک پہنچی تو مجھے بلا لیا اور کہنے لگا میں نے سُنا ہے تم نے اونٹ بیچ دیئے ہیں۔ میں نے کہا ہاں۔ ہارون نے پوچھا کیوں؟ میں نے کہا چونکہ میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں اور غلام ٹھیک طریقے سے کام نہیں کرتے ہیں۔ ہارون کہنے لگا نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ میں جانتا ہوں تجھے اس کام کے لئے کس نے کہا ہے۔ اس کا اشارہ امامؑ کی طرف تھا۔ صفوان نے کہا مجھے اُن سے کیا واسطہ؟ ہارون کہتا ہے ان باتوں کو چھوڑو (میں جانتا ہوں تم ان کے عقیدت مندوں میں سے ہو) اگر تم نے اب تک ہم سے اچھا سلوک نہ کیا ہوا ہوتا تو میں تجھے قتل کر دیتا۔ (رجال کشی ص:۴۴۰)

امامؑ کا پیغام

امام موسیٰ کاظمؑ نے ایک دن اپنے تمام اولادوں کو جمع کیا اور ان سے فرمایا: ''اے میری اولادو! میں تمہیں ایک کام کی سفارش و تاکید کرتا ہوں اگر تم نے اس پہ عمل کیا تو کبھی بھی ہلاک نہیں ہو گے، وہ یہ ہے کہ:

﴿اِذَا اَتَاكُمْ اٰتٍ فَاَسْمَعَ اَحَدَكُمْ فِي الْاُذُنِ الْيُمْنٰى مَكْرُوْهًا ثُمَّ تَحَوَّلَ اِلَى الْاُذُنِ الْيُسْرٰى فَاعْتَذَرَ وَ قَالَ لَمْ اَقُلْ شَيْئًا فَاقْبَلُوْا عُذْرَهٗ﴾ (سفینۃ البحار ج:۲ص:۶۶)

''اگر کوئی شخص تمہارے پاس آئے اور تمہارے دائیں کان میں کوئی غلط بات کہے اور پھر بائیں کان میں معذرت طلب کرے اور کہے کہ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا تو ایسے شخص کا عذر قبول کرلو''۔

آپؑ کا مقصد یہ تھا کہ انسان کے اندر معاف کر دینے کی عادت موجود ہونی چاہئے اور اگر کوئی خطا کار عذر خواہی کرے تو اس کا عذر قبول کر لینا چاہئے۔ بالخصوص ایسے موقع پر جب ایک شخص بُرا بھلا کہے اور انسان بُرا محسوس بھی کرے۔ اب چونکہ خطا کار عذر خواہی کر رہا ہے ایسے موقع پر ایک شریف اور کریم النفس انسان کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس کے عذر کو قبول کرے اور اگر برا بھلا کہنے والا شخص منکر ہو جائے اور کہے میں نے تو آپ کو کچھ بھی نہیں کہا ہے تو اسے یہ نہ کہے کہ نہیں تم جھوٹ بول رہے ہو، تم کس قدر ڈھیٹ اور بے شرم انسان ہو جبکہ ابھی تم میرے دائیں کان میں کیا کہہ رہے تھے، کیا تم نے بُرا بھلا نہیں کہا، اسی قسم کے وغیرہ وغیرہ۔

ارشادِ امامؑ

ہمارے ساتویں امامؑ بھی دوسرے آئمہ اطہار علیہم السلام کی طرح عام لوگوں کے لئے دلسوزی اور ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے اور لوگوں کی ہدایت فرماتے رہتے تھے۔ منحرف اور گمراہ لوگوں کو راہِ راست پہ لاتے تھے۔ آپؑ کے فرامین دل کی گہرائیوں پہ اثر کرتے تھے اور دل پہ گھر کر جاتے تھے۔ آپؑ نے کبھی بھی حق و حقیقت کہنے سے دریغ نہیں کیا اور ہدایت کا کوئی موقع جانے نہیں دیا۔ اس لئے تو آپؑ کے فرامین اہلِ ایمان کے دلوں کو مسلسل گرمائے رہتے تھے بلکہ اب بھی گرمائے ہوئے ہیں۔ مؤمن کو چاہئے کہ وہ آپؑ کے قیمتی ارشادات سے استفادہ کرے اور اپنی تربیت کرے تاکہ انسان کمالِ حقیقی تک پہنچ سکے۔

آسمانی اخلاق

صحیح ہے یہ حیرت انگیز دریافتیں کہ جو پہلے مرحلے پہ نا قابل یقین سے لگتے ہیں اگر غور وفکر کی جائے تو درحقیقت یہ سب راستہ ہموار کر رہے ہیں۔ ہاں مگر کوئی ایسی چیز مال ہے کہ جس کو فراموش کر دینے سے اور غفلت برتنے سے زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ وہ چیز معنویت اور اخلاق ہے۔ ہمیں چاہئے تھا کہ ہم اسے اپنی زندگی کا متن قرار دیتے مگر ہم نے اسے زندگی کے حاشیہ میں جگہ دے رکھی ہے تبھی تو آج کے انسان کو تلخ حالات کا سامنا ہے جو ہماری سنگین نوعیت کی غلطی ہے۔ چونکہ وہ تمام وسائل کو بروئے کار نہیں لایا ہے وہ ہمہ جہتی قسم کی آسائشات کو فراہم نہیں کرسکتا۔ اور اب وہ نئی فکر اور سوچ میں غلطاں ہے اب سوچتا ہے کہ میں کیا کروں؟ اس برائی کے سیلاب کو کس طرح روک لوں؟ اس خطرناک بیماری کو کس طرح اور کس ترتیب سے روکا جا سکتا ہے؟ وہ تنظیمیں بناتا ہے، آرگنائزیشنز تشکیل دیتا ہے، وہ مل بیٹھتے ہیں، گفتگو کرتے ہیں تاکہ اخلاق حسنہ کا اہتمام کریں اور اخلاق ایمانی کے اسلحے سے خود کو لیس کر کے اپنے جسم پہ سجا سکیں۔ مگر یہ سب جانتے ہیں مطلوبہ نتائج کبھی بھی حاصل نہیں ہوتے۔ انہوں نے اس مدد کیلئے صحیح دواء کا انتخاب نہیں کیا شاید بعد میں بھی اس کا اہتمام نہ کر سکیں۔ اب ذرا سوچئے اس درد کا علاج کس طرح ہوگا؟ ہاں اس درد کا علاج مذہب اور دین کے دامن میں پناہ لینے میں پنہاں ہے، آئین الٰہی کے اسلحے سے مسلح ہونے میں مضمر ہے۔ چونکہ دین یعنی اخلاق اور اخلاق بھی وہ جو مکمل معتدل ہو۔ افراط وتفریط سے پاک ہو چونکہ بعض اخلاقی آئین انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں انہیں ایک طرف رکھ دینا چاہئے۔

ہمارے برگزیدہ نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بن عبداللہ نے اپنی تحریک کے شروع میں ہی آواز دی تھی کہ:

﴿اَیُّهَا النَّاسُ قُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا﴾ (مجمع البیان ج:۱۰ص:۵۵۹)

''اے لوگو! کہہ دو کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں ہے تو تم فلاح پا جاؤ گے''۔

اپنی بعثت کے جذبہ محرکہ کو دنیا کے سامنے واضح کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اِنِّیْ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ﴾ (المحجۃ ج:۵ص:۸۹)

''میں صرف اس لئے مبعوث ہوا ہوں تاکہ لوگوں کے درمیان اچھے اخلاق کو مکمل کروں''۔

چونکہ پیغمبر جانتے تھے کہ اخلاق کے بغیر امن و امان اور فلاحی امور انجام نہیں پاتے ہیں اور نہ ہی معاشرے میں عدالت کا قیام ممکن ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد بھی چند پاکیزہ اور سچے افراد نے ان کی تحریک کو جاری وساری رکھا اور لوگوں کیلئے ارشادات و ہدایات کا سلسلہ جاری رکھے رہے اور جس چیز کی نشاندہی ضروری تھی سے لوگوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ اور فرماتے رہے کہ یہ حفاظتی لباس ہے جو تحفظ فراہم کرسکتا ہے، اسے پہن کر بیشک میدان میں جا کر اس کی آزمائش کر لو آپ خود دیکھ لیں گے کہ اخلاق کے مخالفین کس طرح شکست سے دوچار ہو جاتے ہیں اور میدان سے کس طرح بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور خود دیکھنا کہ تمہیں کس طرح فتح و کامرانی نصیب ہوتی ہے اور تمہارے قدم کس طرح پہاڑ کی طرح جمے رہتے ہیں۔ آئیں شیعان جہاں کے امام ہفتم حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے فرامین گہری نظر سے مطالعہ کیجئے اور مناسب مواقع پہ ان سے اچھے طریقے سے استفادہ کیجئے پھر دیکھئے نتیجہ کیا نکلتا ہے۔

سید محمد تقی حکیم

دو چہروں والا انسان

بعض لوگوں کا ظاہر اور باطن ایک جیسا ہوتا ہے؛ وہی کہتے ہیں جو اُن کے دل میں ہوتا ہے اور جو کچھ اُن کے دل میں ہوتا ہے وہی کچھ زبان پر لاتے ہیں۔ لیکن بعض لوگ ایسے نہیں ہوتے وہ خیال کرتے ہیں کہ وہی سب سے زیادہ ہوشیار ہیں اور وہ زبان کے ذریعے لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنا چاہتے ہیں لہٰذا دُوسروں کے ساتھ جب ملتے ہیں تو اُن کے منہ پر اُن کی تعریفیں شروع کر دیتے ہیں لیکن جونہی اُن سے جدا ہوتے ہیں اُن کی غیبت اور بدگوئی شروع کر دیتے ہیں اور اُن پر تہمت لگانے لگتے ہیں اور اُنہیں معاشرت کے قابل انسان ہی نہیں سمجھتے۔ اس قسم کے چرب زبان افراد انتہائی خطرناک لوگ ہوتے ہیں کہ

جواپنی چند روزہ دنیا کی خاطر لوگوں کی عزت وآبرو سے کھیلتے ہیں اور سادہ دل لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔لیکن (ان کے مقابلے میں ایک) مومن ومتین اورخدا ترس انسان ایسا نہیں ہوتا ،وہ جوبات بھی کہتا ہے پہلے اس کے بارے میں غور وفکر کرتا ہےاور ہر لفظ کوموقع ومحل کی مناسبت سے ادا کرتا ہے؛وہ نہ تو کسی کی بے جاتعریف کرتااور نہ ہی کسی کی غیبت کو جائز سمجھتا ہے۔

﴿بِئسَ العَبْدُعَبْدٌ یَکُوْنُ ذَا وَجْهَیْنِ وَذَالِسَانَیْنِ یُطْرِی اَخَاهُ اِذَا شَاهَدَهُ وَیَاْکُلُهُ اِذَا غَابَ عَنْهُ۔﴾ (تحف العقول،ص:۳۹۵)

’’کس قدر بُرا ہے وہ شخص ،جس کے دو چہرےاور دو زبانیں ہوتی ہوں کہ جب اپنے دینی بھائی کو دیکھےتو اس کی تعریف کرےاور اُس کی عدم موجودگی میں (اُس کا گوشت) کھائے یعنی اسکے پیچھے بد گوئی وغیبت کرے‘‘۔

روشن انسان

انسان جسم وروح کا مجموعہ ہےلہٰذا ان دونوں کو روشنی کا حامل ہونا چاہیےتا کہ انسان مادیات ومعنویات پر فائز ہو سکے جسم کی روشنی آنکھوں کی محتاج ہے اور روح کی روشنی کو عقل کی ضرورت ہوتی ہےانسان عقل کی برکت سے معرفت خدا حاصل کرتا ہےاور جب اسے خدا کی معرفت حاصل ہوجاتی ہےتو وہ ایماندار اور دین کا معتقد ہو جاتا ہےاور دین میں بصیرت وبینائی حاصل کر لیتا ہے ۔اور اگر وہ نعمت عقل سے محروم ہو یا اسکی عقل کم ہوتو وہ معرفت خدا کے اس مرحلہ تک نہیں پہنچ سکتا جس کی وجہ سے اُس کا خدا پر ایمان کم اور اسکا دین بھی سطحی ہو گا ۔پس اس کا دین کمزور ہو گا اور اس کے دل میں اس کی جڑیں گہری نہیں ہوسکیں گی۔

﴿اِنَّ ضَوْءَ الجَسَدِ فِی عَیْنِهٖ فَاِنْ کَانَ البَصَرُ مُضِیئاً اِسْتَضَاءَ الْجَسَدُ کُلُّهُ۔وَاِنَّ ضَوْءَ الرُّوحِ الْعَقْلُ۔فَاِذَا کَانَ العَبْدُ عَاقِلاً ،کَانَ عَالِماً بِرَبِّهٖ،وَاِذَا کَانَ عَالِماً بِرَبِّهٖ، اَبْصَرَ دِیْنَهُ، وَاِنْ کَانَ جَاهِلاً بِرَبِّهٖ لَمْ یَقُمْ لَهُ دِیْنٌ۔﴾(تحف العقول،ص:۳۹۶)

’’جسم کی روشنی آنکھ میں ہے اگر آنکھ روشن وبینا ہوتو جسم بھی صاف روشن ہوگااور روح کی روشنی عقل ہے پس اگر انسان عاقل ہوتو اپنے پروردگار کی معرفت حاصل کرلیتا ہےاور جب وہ اپنے پروردگار کی معرفت حاصل کرلےتو وہ اپنے دین میں بینا وبصیر ہو جاتا ہےاور اگر اپنے پروردگار سے نا آشنا ہوتو اس کا دین (ایمان)مضبوط نہیں ہوگا اور وہ ہمیشہ سرگرداں ومضطرب رہے گا‘‘۔

رسوا آرزوئیں

کبھی کبھار انسان آرزوؤں کے بیکراں سمندر میں غوطے لگانے لگتا ہے اور اپنے ذہن میں ایک آرزو بھری زندگی بنالیتا ہے جو روزمرہ اور حقیقی زندگی سے کاملاً مختلف ہوتی ہے ۔مثلاً وہ رہتا تو جھونپڑی میں ہے لیکن اپنا مستقبل محلات میں دیکھتا ہے ۔یا وہ کسی مقام ومنصب پر نہیں ہوتا لیکن مستقبل میں اپنے آپ کوایک وسیع وعریض ملک کا حاکم مطلق تصور کرنے لگتا ہے۔

اگر یہ آرزوئیں امید کی حد تک ہو، اُمید بھی وہ جوانسان کودُکھوں سے آسانی کی طرف لے جائے ۔ نچلے درجے سے اعلیٰ بلکہ بہت ہی اعلیٰ مدارج پر فائز کرنے کی اُمید کرےاس اُمید میں جدوجہد اور عمل کی آمیزش بھی شامل ہوتو ایسی آرزوئیں نہ صرف پسندیدہ ہیں بلکہ انسانی زندگی کا لازمی جزو بھی ہیں اور اگر اُمیدیں مذکورہ حدود وقیود سے تجاوز کر جائیں تو انہیں پورا کرنے کیلئے کڑی شرائط اور ان تھک کوششوں کی ضرورت پڑتی ہے، اگر چہ یہ محال نہیں ہیں اور ان کی تکمیل ممکن ہے بلکہ اکثر اوقات ایسے ہوبھی جاتا ہےصرف اس کیلئے حالات کا سازگار ہونا لازمی ہےاور ان کیلئے زمین سازی کی ضرورت ہوتی ہے اور ساتھ ہی حالات وشرائط کا معاون ومددگار ہونا بھی ضروری ہے،تب جا کر یہ خواہشات کسی مقام تک پہنچ پاتی ہیں ۔ان آرزوؤں کی تکمیل کی شرائط میں سے ایک وقت اور زمانے کی ظرفیت بھی ہے کہ آرزو کنندہ کبھی اس پہ توجہ نہیں کرتا مگر انسان کے پاس اس تھوڑے سے وقت میں کتنی فرصت ہے کہ جس میں وہ ان سب خواہشات کو پا سکے؟

اگر انسان یہ طویل عمری کا راز آشکار ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ اس کوتاہ مدت میں ان لمبی لمبی آرزوؤں اور خواہشات کی تکمیل کیلئے وقت کافی نہیں ہے تو اُمیدیں اور آرزوئیں اپنی عدم تکمیل پہ خود ہی شرمندہ تعبیر ہو کر رہ جائیں او رانہیں رسوائی کا سامنا کرنے پڑے۔اس حقیقت کوامام ہفتم ایک مختصر سے مگر خوبصورت اور معنی خیز جملے میں یوں بیان فرماتے ہیں تا کہ انسان لمبی آرزوں اور طولانی اُمیدوں سے اجتناب کرے، اپنی سوچ اور ذہن کوان پہ صرف نہ

کرے:

﴿لَوْ ظَهَرَتِ الْاٰجَالُ افْتَضَحَتِ الْاٰمالُ﴾ (بحار الانوار، ج:۷۵، ص:۳۳۳)

''اگر عمریں، زندگی کی مدتیں ظاہر ہو جائیں تو آرزوئیں رسوا ہو جائیں''۔

ہلاکت کی آرزو

موت بعض انسانوں کے لئے سعادت اور بعض کے لئے ہلاکت ہوتی ہے جو لوگ اپنے آپ کو موت کے لئے آمادہ کر لیتے ہیں اور آخرت کے لئے ضروری سامان (سفر) تیار رکھتے ہیں اُن کے لئے موت سعادت ہے لیکن جو لوگ اس قسم کی تیاری و آمادگی نہیں رکھتے تو موت اُن کے لئے ہلاکت ہے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے موت کی آرزو کرنے والے ایک شخص سے فرمایا:

﴿هَل بَينَكَ وَبَيْنَ اللّٰهِ قَرَابَةٌ يُحَامِيكَ لَهَا؟ قَالَ: لَا، قَالَ فَهَلْ لَكَ حَسَنَاتٌ قَدَّمْتَهَا تَزِيْدُ عَلٰى سَيِّآتِكَ؟ قَالَ: لَا، قَالَ فَاَنْتَ اِذًا تَتَمَنّٰى الْاَبَدَ۔﴾ (سفینۃ، ج:۲، ص:۵۵۸)

''کیا تیرے اور خداوند کے درمیان کوئی رشتہ داری ہے کہ جس کی وجہ سے خدا تیری حمایت کرے گا؟ اُس شخص نے جواب دیا: ''نہیں''۔

امامؑ نے فرمایا: کیا تو نے اتنے نیک اعمال انجام دیئے ہیں کہ جو تیرے بد اعمال سے زیادہ ہوں اور تو اُنہیں لے کر جائے (تاکہ قیامت کے روز اُن کے اجر سے فائدہ اُٹھا سکے) وہ شخص بولا: نہیں (میرے نیک اعمال اتنے نہیں ہیں)۔ تب امام علیہ السلام نے فرمایا: پس تو (جو موت کی آرزو کر رہا ہے درحقیقت) ابدی ہلاکت کی آرزو کر رہا ہے۔

آسائش

بعض لوگ اپنی محنت اور جدوجہد سے کافی کچھ کما لیتے ہیں جس سے وہ اپنے خاندان اور اپنے زیر کفالت و سرپرستی افراد کی باآسانی زندگی بسر کرنے کا سامان مہیا کر سکتے ہیں۔ ایسے افراد کا خاندان اگر چہ بہت زیادہ ہی کیوں نہ ہو پھر بھی ان کے لئے کوئی پریشانی نہیں ہوتی وہ ان سب کو باآسانی کھلا سکتے ہیں۔ ایسے شخص کو معاشی لحاظ سے آسودہ حال کہا جائے گا۔ بے شک وہ ایک خوشحال زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے، بے شک اسے زندگی کی دوسری جہات سے چند پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہوتا ہے یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔

جبکہ بعض افراد اس کے برعکس زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں ان کا کنبہ چھوٹا ہوتا ہے اور ان کی آمدن بھی کم ہوتی ہے، یہ حضرات بھی اپنی زندگی کا سفر بڑی خوش اسلوبی سے طے کر رہے ہوتے ہیں۔ چونکہ جب کھانے والے افراد کم ہوں گے کنبہ چھوٹا ہوگا اس مقدار سے حرص و لالچ بھی کم ہوگا۔ خاندان کا سربراہ کمانے اور زیادہ محنت مشقت کرنے پہ مجبور نہیں ہوگا لہٰذا وہ معمولی محنت و مشقت کے ذریعے آسانی سے خاندان کے افراد کی تعداد کے لحاظ سے اخراجات برداشت کرے گا، نتیجتاً وہ آرام و سکون سے زندگی بسر کرے گا لہٰذا آسائش اور راحت و سکون دو صورتوں میں میسر آ سکتی ہے۔ ایک زیادہ آمدن کے ذریعے بیشک خاندان بڑا ہی کیوں نہ ہو دوسرا کم خاندان ہونے کی صورت میں کم آمدنی سے بھی ممکن ہے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿قِلَّةُ الْعِيَالِ اَحَدُ الْيَسَارَيْنِ۔﴾ (تحف العقول، ص:۴۰۳)

''اہل و عیال کی عددی کمی زندگی کو آسان بنانے کے دو راستوں میں سے ایک راہ ہے''۔

اجتماعی زندگی کے فوائد

ہر انسان کی زندگی کا اجتماعی اور انفرادی ہر لحاظ سے ایک طے شدہ پروگرام ہوتا ہے۔ مثلاً کہ وہ کن لوگوں کی صحبت اختیار کرے، کن لوگوں سے آداب زندگی سیکھے، کن افراد کی اطاعت کرے، اپنے آپ سے کس قسم کا استفادہ کرے اور جو افراد اس سے مشورہ طلب کریں ان کی نسبت اس پہ کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور جو بندہ تکلیف و اذیت میں ہے ان سے کس طرح نبرد آزما ہو سکے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

قَالَ عَلِيُّ بْنُ الْحُسَيْنِ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ:

﴿مُجَالَسَةُ الصَّالِحِينَ دَاعِيَةٌ إِلَى الصَّلَاحِ. وَآدَابُ الْعُلَمَاءِ زِيَادَةٌ فِي الْعَقْلِ وَطَاعَةُ وُلَاةِ الْعَدْلِ تَمَامُ الْعِزِّ. وَاسْتِثْمَارُ الْمَالِ تَمَامُ الْمُرُوَّةِ وَإِرْشَادُ الْمُسْتَشِيرِ قَضَاءٌ لِحَقِّ النِّعْمَةِ. وَكَفُّ الْأَذَى مِنْ كَمَالِ الْعَقْلِ وَفِيهِ رَاحَةُ الْبَدَنِ عَاجِلاً وَآجِلاً.﴾ (اصول کافی، ج:۱،ص:۲۰)

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اپنے جد بزرگوار حضرت علی بن الحسین (امام زین العابدین علیہم السلام) سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''نیک وصالح افراد کی دوستی، صلاح وسعادت کا موجب ہے۔علماء سے ادب سیکھنا،عقل کی زیادتی کا سبب ہے، عادل حاکموں کی اطاعت،عزت و سربلندی کا باعث ہے، مال کا استعمال اوراس سے استفادہ جوانمردی ہے،مشورہ کرنے والے کی راہنمائی نعمت کا حق ادا کرنا ہے،لوگوں کے آزار سے پرہیز، کمال عقل کا سرچشمہ ہے اور اسی میں بدن کی راحت و آسائش ہے خواہ دنیا میں ہو خواہ آخرت میں۔

بیجا احسان

انسان احساسات اور جذبات کا مجموعہ ہے اور وہ اسی بنیاد پر زندگی بسر کرتا ہے۔اس کے احساسات وغیرہ مستقبل کے حالات کی نسبت کبھی اعتدال پر مبنی ہوتے ہیں اور کبھی افراط وتفریط کا شکار ہو جاتے ہیں، یعنی اس کی تین صورتیں سامنے آتی ہیں یا اس کی حالت بالکل معمولی و نارمل (Normal) ہوتی ہے یا پھر غیر معمولی (Abnormal) ہوتی ہے یعنی ایک ناشائستہ حالت اس کے بارے میں مشاہدہ کی جاتی ہے۔یا وہ بہت حساس ہو جاتا ہے کہ تھوڑی سی تکلیف ہو جانے کی صورت میں وہ بہت زیادہ دُکھ و الم محسوس کرنے لگتا ہے یا پھر اس کے برعکس کسی قسم کا ردِّعمل مشاہدہ نہیں کیا جاسکتا ہے، اور الفاظ اس کے اندر ہی اندر رس گھولتے رہتے ہیں۔اس کے باطن سے بھی کوئی چیز محسوس نہیں ہوتی۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اس تیسرے گروہ کے متعلق ایک چھوٹے سے مگر خوبصورت جملے میں اشارہ فرماتے ہیں کہ:

''جو بندہ بُرائی سے ناخوش نہیں ہوتا وہ کبھی بھی اچھائی سے خوش نہیں ہوتا''۔

یعنی مولاؑ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ:

''عام طور پر گفتار و رفتار انسان پہ مثبت یا منفی اثر ضرور رکھتی ہے ورنہ اچھائی اور برائی انسان کے لئے ایک بے معنی سی چیز ہو کر رہ جائے گی۔

امام کا مقصد یہ نہیں ہے کہ لاپرواہ قسم کے انسان سے نیکی اور احسان نہ کرو بلکہ آپ کا مقصد ایک خاص حالت کو بیان کرنا ہے اور بعض لوگوں کے رویوں اور ان کے ردِّعمل کو بیان کرنا ہے۔

﴿مَنْ لَمْ يَجِدْ لِلْإِسَاءَةِ مَضَضاً، لَمْ يَكُنْ لِلْإِحْسَانِ عِنْدَهُ مَوْقِعٌ.﴾ (بحار الانوار، ج:۷۵،ص:۳۳۳)

''جو شخص اپنے اندر بدی سے نفرت کا جذبہ نہ پاتا ہو اس کے نزدیک نیکی کی بھی کوئی وقعت نہیں ہوتی''۔

کامل نیکی

احسان کا معنی ہے نیکی کرنا اور محسن یعنی نیکی کرنے والا۔احسان جس طرح عقل و منطق کی رُو سے ایک پسندیدہ عمل ہے اسلام نے بھی اسی طرح اس کی تاکید کی ہے اور اس کیلئے اجرِ عظیم رکھا ہے البتہ مکمل نیکی کیلئے تین شرائط کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔اوّل انسان نیکی کو عظیم اور بڑا نہ سمجھے کیونکہ چھوٹا سمجھنے سے نیکی کی انجام دہی میں آسانی رہے گی۔دوم یہ کہ احسان (نیکی) چھپ کر انجام دے، اسے اعلانیہ اور سب کے سامنے انجام دینے سے اجتناب کرے۔سوم اسے انجام دینے میں سُستی نہ کرے ورنہ ہو سکتا ہے کہ تاخیر کی صورت میں اسے وسوسے اور پریشانیاں آ گھیریں اور وہ اسے ترک کرنے پہ مجبور ہو جائے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿وَالصَّنِيعَةُ لَا تَتِمُّ صَنِيعَةً عِنْدَ الْمُؤْمِنِ لِصَاحِبِهَا إِلَّا بِثَلَاثَةِ أَشْيَاءَ تَصْغِيرِهَا وَسَتْرِهَا وَتَعْجِيلِهَا.﴾ (تحف العقول،ص:۴۰۳)

''ایک مؤمن کی نیکی اس وقت تک کامل نہیں ہوتی جب تک اس کے اندر تین صفات موجود نہ ہوں اول یہ کہ اپنے نیک عمل کو چھوٹا سمجھا جائے، دوم یہ کہ نیک عمل کو دوسروں سے پنہاں رکھے سوم یہ کہ اس نیک عمل کے بجالانے میں جلدی کرے''۔(نیکی کر دریا میں ڈال۔مترجم)

اخلاق

ذیل کی حدیث اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی دوسری بہت سی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور نیک اخلاق کے درمیان ایک اٹوٹ تعلق پایا جاتا ہے اور نیک اخلاق ہی ایمان کامل کی واضح علامت ہے۔چونکہ ایمان ہی انسان کو نیک اخلاق اپنانے پہ اُکساتا ہے اور بد اخلاقی و بدخُلقی سے روکتا ہے۔ لہٰذا جس کا جس قدر ایمان زیادہ ہوگا اس کا اخلاق بھی اُتنا ہی بہتر ہوگا۔البتہ نیک اخلاق سے مراد فقط خندہ پیشانی خوش طبعی چرب زبانی نہیں ہے بلکہ نیک اخلاق کا اطلاق تمام فرائض و ذمہ داریوں پر ہوتا ہے۔بنابرایں خوش اخلاق وہ ہے کہ جو اپنے فرائض پر عمل پیرا ہوتا ہے اور اسے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے اور وہ دوسروں کے حقوق کا احترام کرتا ہے۔مختصر یہ کہ وہ خدا اور مخلوق کے حقوق کا خیال رکھتا ہے اور کبھی بھی اس میں کوتاہی نہیں کرتا۔

﴿اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِینَ اِیمَاناً، اَحْسَنُهُمْ خُلُقاً﴾(تحف العقول ص ۳۹۵)

''ایماندار لوگوں میں سے جس کا اخلاق جتنا زیادہ نیک ہے اس کا ایمان بھی اتنا ہی زیادہ کامل ہے''۔

بے جا دعویٰ

بعض لوگ جس بات کو نہیں جانتے اور وہ جو نہیں ہوتے اس کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں۔مثلاً انہیں کسی چیز کا علم نہیں ہے یا علم کے کسی مرتبے تک نہیں پہنچ پائے ہیں مگر پھر بھی اس کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں،کوئی ہنر وصنعت نہیں جانتے لیکن ظاہر یہ کرتے ہیں وہ سب کچھ جانتے ہیں۔اس قسم کے بے جا دعوے لوگوں کے درمیان تعلقات میں خلل ایجاد کرتے ہیں چونکہ جب لوگ ان کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اُن کے علم وہنر سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں کہ جس کا وہ ادعا کرتے ہیں تو ان کے دامن خالی ہوتے ہیں اور وہ دُوسروں کو مستفید نہیں کر پاتے ہیں لہٰذا انسان جو کچھ ہے اس سے زیادہ اپنے آپ کو ظاہر نہ کرے اور اپنے ساتھ غیر واقعی نسبت نہیں دینی چاہیے۔

جو لوگ اس بات کا خیال نہیں رکھتے تو وہ اپنے حالات سے آگاہ لوگوں کے غصے کو اُبھارتے ہیں اور سادہ لوگوں کے لئے رنج و دُکھ کا باعث بنتے ہیں۔چونکہ دانا افراد فوراً جان لیتے ہیں کہ یہ جھوٹا دعویٰ کر رہا ہے لیکن نادان افراد اُن کے دھوکے اور فریب میں آجاتے ہیں اور اُن کے ادعا کے مطابق کوئی نہ کوئی کام اُن کے سپرد کر دیتے ہیں کہ جسے وہ اچھی طرح انجام نہیں دے پاتے لہٰذا کام دینے والا شخص مصیبت کا شکار ہو جاتا ہے۔

﴿مَنِ ادَّعیٰ مَا لَیْسَ لَهُ فَهُوَ اَعْنیٰ لِغَیْرِهِ﴾ (تحف العقول ص ۳۹۷)

''جو کسی ایسی چیز کا دعویٰ کرے جو اس میں نہیں ہے پس اس نے دوسروں کو مشکل میں ڈال دیا''۔

کامل اسلام

بعض لوگ ہر کام میں دخل اندازی کرتے ہیں اور ہر شخص کے بارے میں چاہے کچھ جانتے ہوں یا نہ،اپنی رائے کا اظہار ضرور کرتے ہیں اور بغیر کسی وجہ و سبب کے ہر بات میں اپنا نقطۂ نظر ضرور بیان کرتے ہیں اور لوگوں کے لئے اُن کی ذمہ داری متعین کرنے لگتے ہیں جبکہ ایک مسلمان کا فریضہ ہے کہ وہ اسلام کے احکام پر عمل کرے تاکہ اسکا دین کامل ہو جائے۔

اسلام کے احکام میں سے ایک حکم یہ ہے کہ جو کام آپ سے متعلق نہیں اس میں دخل نہ دیں اور جو بات اس کے لئے اہمیت نہیں رکھتی اس کے بارے میں اظہار رائے نہ کرے اور اپنے کردار و گفتار کو فقط اپنے فرائض تک محدود رکھے چونکہ انسان کا دماغ اور زبان بہت ہی محترم ہیں لہٰذا بغیر کسی سبب وعلت کے غیر متعلق کاموں میں انہیں ہرگز استعمال نہ کرے بلکہ فرصت کے قیمتی لمحات ان امور میں ہرگز صرف نہ کرے۔

﴿مِنْ حُسْنِ اِسْلامِ الْمَرْءِ تَرْکُ مَا لا یَعْنِیهِ﴾ (تحف العقول ص ۳۹۵)

''جو چیز جس شخص کیلئے اہم نہ ہو اُسے ترک کرنا اُس شخص کے اچھا مسلمان ہونے کی نشانی ہے''۔

اقلیت

پوری دنیا میں اکثریت کی رائے کو قبول کیا جاتا ہے اور اقلیت کی رائے کو رد کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ آپ انجمنوں، میٹنگوں اور محافل و مجالس میں ملاحظہ کرتے ہیں کہ اکثریت کی آراء کو عمل کا معیار قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ بات (قانون) مذہب و مسلک کے انتخاب میں درست نہیں اور نہ ہی یہ سچائی اور حق کیلئے معیار بن سکتی ہے۔ پوری تاریخ میں صادق اور مومن افراد کی تعداد بدکاروں بے ایمانوں کی نسبت ہمیشہ کم رہی ہے۔ اور انبیاء وائمہ اطہار علیہم السلام کے اصحاب و پیروکار اُن کے مخالفین اور معاندین کی نسبت اقلیت میں رہے ہیں۔

امام کاظم ؑ فرماتے ہیں:

﴿ثُمَّ مَدَحَ الْقِلَّةَ فَقَالَ (اصول کافی؛ ج ۱، ص ۱۵۔)، وَقَلِيلٌ مِنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ۔ (سورۂ سبا؛ آیت ۱۳)، وَقَالَ: وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ (سورۂ ص ،آیت ۲۴)﴾

''اس کے بعد خداوند تبارک وتعالی نے اقلیت کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: میرے بندوں میں سے بہت قلیل لوگ ہیں جو شکر گذار ہیں اور پھر فرمایا: وہ (ایماندار اور نیک کردار لوگ) کس قدر کم ہیں''۔

اکثریت

جیسا کہ عرض کیا ہے کہ ہمیشہ اکثریت مدنظر ہوتی ہے اور اسے اہمیت دی جاتی ہے لیکن ایماندار لوگوں کے بارے میں یہ مسئلہ معیار نہیں بنتا اور نہ ہی حجت قرار پاتا ہے چونکہ اکثریت ہمیشہ غیر مومن افراد کے ساتھ رہی ہے لہٰذا ہمیشہ اور ہر جگہ اکثر لوگوں کے طور طریقے کو عمل کے درست ہونے کا معیار نہیں بنایا جاسکتا۔

جیسا کہ امام کاظم ؑ نے درج ذیل کلام میں قرآن سے تمسک کرتے ہوئے نہ صرف اکثریت کی تائید نہیں کی بلکہ اس کی مذمت بھی فرمائی ہے:

﴿ثُمَّ ذَمَّ اللّٰهُ الْكَثْرَةَ فَقَالَ: وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ﴾ (۱) اصول کافی؛ ج ۱، ص ۱۵، (۲) سورۂ انعام ؛آیت ۱۱۶)

''پھر خداوند تبارک وتعالی نے اکثریت کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا: اگر زمین پر لوگوں کی اکثریت کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں خدا کی راہ سے گمراہ کر دیں گے''۔

امانت اور صداقت

ایسے کام کریں کہ جن کی وجہ سے آپ کو امین کہا جائے اور لوگوں میں آپ ایک سچے انسان کے طور پہ پہچانے جائیں تا کہ خدا کا لطف و کرم آپ کے شامل حال ہو سکے اور آپ کے رزق میں اضافہ ہو سکے اور جہاں تک ممکن ہو جھوٹ اور خیانت سے اجتناب کریں تا کہ جھوٹ کی وجہ سے آپ کو دروغ خانہ سمجھا جائے اور فقر و تنگدستی آپ پر مسلط نہ ہو سکے۔

امام موسیٰ کاظم ؑ ان صفات کے اثرات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿أَدَاءُ الْأَمَانَةِ وَالصِّدْقِ يَجْلِبَانِ الرِّزْقَ وَالْخِيَانَةُ وَالْكِذْبُ يَجْلِبَانِ الْفَقْرَ وَالنِّفَاقَ۔﴾ (تحف العقول، ص ۴۰۳)

''صداقت اور امانتداری رزق کی زیادتی اور خیانت و جھوٹ، فقر و نفاق کا سبب بنتے ہیں''۔

غم اور بڑھاپا

غم واندوہ انسان کے اعصاب کو کمزور اور چور چور کر دیتے ہے جس کی وجہ سے انسان کمزور اور اُس کی جسمانی قوتیں ناتواں ہو جاتی ہیں۔ اسی جسمانی کمزوری اور لاغر پن کو بڑھاپا کہا جاتا ہے، یہ ہر شخص کو لاحق ہوسکتا ہے لہٰذا انسان کو زندگی کے مصائب اور مشکلات میں صبر و استقامت سے کام لینا چاہیے تا کہ

انسان خدا پر ایمان اور اُسکی مشیت و حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم رکھتے ہوئے اپنے اعصاب پہ قابو رکھ سکے اور ہمیشہ خدا کی نعمتوں کا شکریہ بجا لاتا رہے اور ہمیشہ زندگی کے مثبت پہلوؤں کو اپنے سامنے رکھ کے اپنی مشکلات کا حل صحیح طریقے سے تلاش کرے اور کبھی بھی غم اور غصے کی کیفیت کو اپنے اُوپر مسلط نہ ہونے دے اور جان لے کہ غم واندوہ کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہو سکتے اور نہ ہی اس طرح کسی ممکنہ حادثے کا سدباب کیا جا سکتا ہے، چونکہ جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا اُس پر غم واندوہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اس بارے میں ایک مختصر ترین لیکن بامعنی جملے میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿كَثْرَةُ الْهَمِّ يُورِثُ الْهَرَمَ﴾ (تحف العقول، ص ۴۰۳)

''بہت زیادہ غم انسان کو بہت جلد بوڑھا کر دیتا ہے''۔

انسان کامل

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام انسان کامل کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿كَانَ اَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَقُولُ مَا تَمَّ عَقْلُ امْرِءٍ حَتّٰى يَكُونَ فِيهِ خِصَالٌ شَتّٰى: اَلْكُفْرُ وَالشَّرُّ مِنْهُ مَامُونَانِ، وَالرُّشْدُ وَالْخَيْرُ مِنْهُ مَامُولَانِ، وَفَضْلُ مَالِهِ مَبْذُولٌ، وَفَضْلُ قَوْلِهِ مَكْفُوفٌ، وَنَصِيبُهُ مِنَ الدُّنْيَا الْقُوتُ، لَا يَشْبَعُ مِنَ الْعِلْمِ دَهْرَهُ، اَلذُّلُّ اَحَبُّ اِلَيْهِ مَعَ اللّٰهِ مِنَ الْعِزِّ مَعَ غَيْرِهِ، وَالتَّوَاضُعُ اَحَبُّ اِلَيْهِ مِنَ الشَّرَفِ، يَسْتَكْثِرُ قَلِيلَ الْمَعْرُوفِ مِنْ غَيْرِهِ، وَيَسْتَقِلُّ كَثِيرَ الْمَعْرُوفِ مِنْ نَفْسِهِ، وَيَرَى النَّاسَ كُلَّهُمْ خَيْراً مِنْهُ، وَاَنَّهُ شَرُّهُمْ فِي نَفْسِهِ وَهُوَ تَمَامُ الْاَمْرِ﴾ (اصول کافی، ج۱، ص۱۸)

''حضرت امام موسیٰ بن جعفر علیہم السلام، امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''درج ذیل صفات وہ ہیں کہ جس شخص میں پائی جائیں اس کی عقل کامل ہوتی ہے وہ کفر اور شر و فساد سے مبرّا ہو اور اچھے کردار کا حامل ہو اور اپنے گرد تمام افراد کو نیکی کی ہدایت کرے اس کا زیادہ سے زیادہ مال راہ خدا میں خرچ ہو، کم گفتگو کا عادی ہو، دنیا سے اس کا حصہ ضروریات (زندگی) تک محدود ہو اور وہ اپنی پوری زندگی علم سے سیر نہ ہو خدا کی خاطر ذلت اس کے لئے غیر خدا کی عطا کردہ عزت سے بہتر ہو وہ بڑا بننے سے زیادہ تواضع وفروتنی کو اہمیت دیتا ہو۔ دوسروں کے نیک اعمال کو زیادہ اور اپنے نیک کاموں کو قلیل سمجھتا ہو اور دوسرے لوگوں کو اپنے سے بہتر سمجھتا ہو اور اپنے نفس کو سب سے بدتر خیال کرتا ہو اور یہی کل امر (کل خیر) ہے''۔

اولین و آخرین

موت سے اس دُنیا کی زندگی کا اختتام اور ایک دُوسری دُنیا کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔(وہ دُوسری دُنیا) یہ وہ جہاں ہے جس میں انسان نے اس دُنیا میں جو اعمال انجام دیئے ہیں کی جانچ پڑتال ہوگی۔ پس انسان اگر موت سے غافل ہے تو وہ بڑی بیباکی کے ساتھ ہر قسم کی خیانت اور جرائم کا ارتکاب کرنے لگے گا اور اپنی جائز و ناجائز خواہشات کی تکمیل کیلئے کسی حدود و ضابطے کا قائل نہیں رہے گا۔لیکن اگر اسے ہر دم موت یاد رہتی ہو اور عالم آخرت کی فکر دامن گیر رہتی ہو تو وہ کبھی بھی بغیر سوچے سمجھے کوئی قدم نہیں اُٹھائے گا۔لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کون سی چیز انسان کو موت کی یاد دلاتی ہے جبکہ موت کی یاد دلانے والے عوامل بہت زیادہ ہیں لیکن جو چیز سب سے زیادہ انسان کو موت کی طرف متوجہ کرتی ہے وہ قبر ہے۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ایک قبر کے پاس کھڑے ہو کر ارشاد فرماتے تھے:

﴿اِنَّ شَيْئاً هٰذَا آخِرُهُ لَحَقِيقٌ اَنْ يُزْهَدَ فِي اَوَّلِهِ، وَاِنَّ شَيْئاً هٰذَا اَوَّلُهُ لَحَقِيقٌ اَنْ يُخَافَ آخِرُهُ﴾ (تحف العقول، ص ۴۰۸)

''وہ دنیا کہ جس کا انجام یہ (قبر) ہے بہتر ہے کہ اس کے اول کی جانب رغبت و خواہش نہ کی جائے اور وہ آخرت کہ جس کا نقطۂ آغاز یہ (قبر) ہے بہتر ہے کہ اس کے آخر سے ڈرا جائے''۔

اہل و نا اہل

(عالم) جاننے والے کی ذمہ داری (دُوسروں کو) سکھانا ہے اور (جاہل) نہ جاننے والے کی ذمہ داری سیکھنا ہے۔لیکن اس کی بھی کچھ شرائط اور شروط ہیں ۔ یہ سکھانا اور سیکھنا دونوں خدا کی خاطر ہوں اور فرد اور معاشرے کی اصلاح کی خاطر ہونے چاہیں ۔ چونکہ اگر ایسا نہیں ہو گا تو حق سے عدول اور صحیح راستے سے انحراف ہوگا۔لہٰذا اگر نادان علم وحکمت حاصل کرنا چاہتا ہے تا کہ خود کمال تک پہنچے اور دوسروں کی بھی خدمت کرے اور وہ اس کام کی اہلیت بھی رکھتا ہے تو دانا شخص کو چاہیے کہ وہ اُسے علم سکھائے اگر وہ اُسے علم نہیں سکھائے گا تو اُس پر ظلم کرے گا لیکن اگر جاہل شخص کا حصول علم کا مقصد اس سے غلط فائدہ اُٹھانا ہو اور لوگوں کو گمراہ کرنا اور تباہی کی طرف لے جانا ہو تو وہ نا اہل شخص ہے اور دانا شخص کو چاہیے کہ وہ ایسے شخص کو علم نہ سکھلائے ورنہ وہ علم وحکمت کا حق ضائع کردے گا:

﴿لاٰ تَمْنَحُوا الجُهّٰالَ الْحِكْمَةَ فَتَظْلِمُوها وَلاٰ تَمنَعوُها أَهْلَها فَتَظْلِمُوهُمْ﴾(تحف العقول ص ۳۸۹)

’’نا اہل افراد کوعلم وحکمت نہ سکھائیں تا کہ علم وحکمت پر ظلم نہ ہو اور اہل افراد سے حکمت وعلم نہ چھپائیں تا کہ ان پر ظلم نہ ہو‘‘۔

جتنا ایمان زیادہ اُتنی ہی آزمائش بھی زیادہ

ترازو کے دونوں پلڑے جب وزن سے خالی ہوتے ہیں تو ایک ہی سطح پر برابر برابر رہتے ہیں،لیکن جونہی اُس کی ایک طرف اگر کوئی چیز رکھی جائے تو جتنی بھی وہ چیز وزنی ہوگی ترازو کا وہ حصہ اتنا ہی نیچے ہو جائے گا۔ ہمارے ساتویں امامؑ نے اپنے اس قیمتی کلام میں انسان کو ترازو سے تشبیہ دی ہے، اس سے امامؑ کی مراد یہ ہے کہ مومن انسان کا ایمان جس قدر زیادہ ہوتا ہے خداوند متعال بھی اس سے اُتنا ہی زیادہ امتحان لیتا ہے ۔ یہاں تک کہ اُس کو مشکلات پیش آتی ہیں، وہ سختیوں میں مبتلا ہوتا ہے اور مصائب اُس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔لیکن اگر وہ ان سب مشکلات میں سرفراز ہوکر ہر امتحان میں کامیاب ہو جائے اور اس کے ایمان میں کوئی خلل واقع نہ ہو تو خداوند متعال اُن مشکلات کے بدلے میں اُسے عظیم ثواب سے نوازے گا۔

﴿اَلْمُؤْمِنَ مِثْلُ كَفَّتَيِ الْمِيزٰانِ كُلَّمٰا زِيدَ فِي ايمٰانِهِ زِيدَ فِي بَلاٰئِهِ﴾ (تحف العقول ص ۴۰۸)

’’مومن آدمی کی مثال ترازو کے دو پلڑوں کی مانند ہے جوں جوں اس کا ایمان زیادہ ہوتا جائے گا خدا کی جانب سے اس کا امتحان بھی سخت سے سخت تر ہوتا جائے گا‘‘۔

فقر وطول عمر کا خیال

بخل ایک ناپسندیدہ صفت ہے جو انسان کے ہاتھ باندھ دیتی ہے اور اسے فرائض کی ادائیگی سے روک دیتی ہے۔انسان کو حیران وتردد بنا دیتی ہے۔ انسان کو قطع ویقین سے بعید اور ذمہ داریوں کی انجام دہی سے بھی دُور کر دیتی ہے۔ لالچ بھی ناپسندیدہ صفات میں سے ہے اور انسان کو جدو جہد اور کوشش کرنے سے روک دیتی ہے اور انسان کو بالکل ناکارہ بنا دیتی ہے اور اسے تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کرتی ہے۔پس انسان کو ان عوامل سے ہرگز اجتناب کرنا چاہیے جو ان مذکورہ صفات کا سبب بنتے ہیں۔

اس سلسلے میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے خبردار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ:

﴿لاٰ تُحَدِّثُوا أَنْفُسَكُمْ بِفَقْرٍ وَلاٰ بِطُولِ عُمْرٍ ، فَإِنَّهُ مَنْ حَدَّثَ نَفْسَهُ بِالْفَقْرِ بَخِلَ، وَمَنْ حَدَّثَهٰا بِطُولِ الْعُمْرِ يَحْرِصُ﴾ (تحف العقول، ص:۴۱۰)

’’کبھی بھی اپنے لئے فقر وطول عمر کی پیشگوئی نہ کریں چونکہ فقر کے خیال سے تم بخیل اور طول عمر کے خیال سے تم حریص ہو جاؤ گے‘‘۔

بلند ترین رتبہ

بعض حضرات مال و دولت کو شخصیت کا معیار سمجھتے ہیں اور ان کے خیال میں مال و دولت کی فراوانی ہی ان کی عزت و مقام میں اضافے کا سبب بن

رہی ہوتی ہے۔ان کے اطراف میں ہمیشہ خوشامدی افراد کا جھرمٹ لگا رہتا ہے اور وہ ہمیشہ اپنے مفادات کی تکمیل کیلئے ان کا احترام کرتے ہیں اور اس کی تعظیم و تکریم بجالاتے ہیں۔البتہ اس طرح ان کے نظریہ (جتنی دولت زیادہ ہوگی اتنی ہی عزت زیادہ ہوگی) کو تقویت ملتی ہے مگر ایک سنجیدہ اور عقلمند شخص اس طرح قطعاً نہیں سوچتا بلکہ وہ اچھے طریقے سے جانتا ہے کہ انسانیت کا تعلق ان حالات، صفات اور طور طریقوں سے ہوتا ہے جو انسان کی شرافت میں اضافے کا سبب بنتے ہیں اور اس کے اندر بڑائی و عظمت پیدا کردے یہ چیزیں مال و ثروت اور دُوسری دُنیاوی وسائل سے ہرگز حاصل نہیں ہوتی ہیں۔

امام ہفتم حضرت موسیٰ ابن جعفر علیہم السلام اپنے مذکورہ کلام میں اس حقیقت کو یوں بیان فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ اَعْظَمَ النّاسِ قَدْراً، اَلَّذِي لاٰ يَرَى الدُّنْيٰا لِنَفْسِهِ خَطَراً۔﴾ (اصول کافی، ج:۱، ص:۱۹)

''لوگوں میں سے بلند رتبہ و صاحب قدر و منزلت شخص وہ ہے کہ جو دنیا (مادیات) کو اپنے لئے قدر و منزلت کا باعث نہ سمجھتا ہو''۔

بخشش اور جزا

لوگ عام طور پر فقر و غربت سے خوفزدہ رہتے ہیں، ان کی دسترس میں جو مال و دولت ہوتی ہے کے کم ہو جانے کا خوف بھی ان پر طاری رہتا ہے تبھی تو وہ ہمیشہ اسی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں کہ کسی طرح ان کی آمدن کے ذرائع میں مسلسل اضافہ ہو جائے اور جو کچھ ان کے پاس موجود ہوتا ہے اسے اپنے حال اور مستقبل کیلئے اور اپنی اولاد کیلئے جمع کرتے رہتے ہیں۔جب کبھی راہ خدا میں کچھ دینے اور خرچ کرنے کا مرحلہ آتا ہے تو وہ دُوسروں کی مالی امداد کو اپنے مال میں کمی اور بجٹ کم ہونے کا بہانہ بنا کر ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔ان میں دوسروں کی مدد کرنے کی ہرگز جرأت نہیں ہوتی، نہ ہی راہ خدا میں خرچ کرنے کی بھی۔

مگر جو لوگ یقین رکھتے ہیں کہ اس دُنیا میں راہ خدا میں جتنا بھی خرچ کیا جائے گا خداوند کریم اس کا نعم البدل اور بہترین جزاء دُنیا و آخرت دونوں جہانوں میں عطا کریں گے۔اس لحاظ سے انہیں کسی قسم کا خوف نہیں ہوتا، وہ مکمل رضا و رغبت کے ساتھ خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے بالکل دریغ نہیں کرتے ہیں۔

﴿مَنْ اَيْقَنَ بِالْخَلَفِ جٰادَ بِالْعَطِيَّةِ﴾ (تحف العقول، ص:۴۰۳)

''جو شخص جزا پر اطمینان رکھتا ہو وہ احسن طریقے سے بخشش کرتا ہے''۔

سخاوت اور خوش اخلاقی

اخلاق حسنہ اور سخاوت سے آراستہ انسان کتنا حسین ہوتا ہے۔سخی اور معاف کرنے والا انسان خدا کے ہاں محبوب اور مخلوق کی نظر میں ہر دلعزیز اور سب کا منظور نظر قرار پاتا ہے۔ایک خوش اخلاق شخص اپنے عمل پہ بھی گہرا اثر رکھتا ہے، جب بھی وہ اپنے فرائض کو انجام دیتا ہے تو خصوصی عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔اور جس انسان کے اندر مذکورہ دو شرائط پائی جائیں وہ خدا کی عنایت اور لوگوں کی طرف سے خصوصی عزت و احترام کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

حضرت موسیٰ ابن جعفر علیہم السلام فرماتے ہیں:

﴿اَلسَّخِيُّ الْحَسَنُ الْخُلْقِ فِي كَنَفِ اللّٰهِ، لاٰ يَتَخَلَّيُّ اللّٰهُ عَنْهُ حَتّيٰ يُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ۔ وَمٰا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيّاً اِلاّٰ سَخِيّاً۔ وَمٰازٰالَ اَبِي يُوصِينِي بِالسَّخٰاءِ وَحُسْنِ الْخُلْقِ حَتّيٰ مَضيٰ﴾ (تحف العقول، ص:۴۱۲)

''خوش اخلاق، سخی پر خدا مہربان ہوتا ہے اور مدد خدا ہمیشہ اس کے شامل حال رہتی ہے یہاں تک کہ وہ داخل بہشت ہو جاتا ہے اور خداوند تبارک و تعالیٰ نے کسی پیغمبر کو مبعوث نہیں فرمایا مگر یہ کہ وہ سخاوت مند ہو میرے والد بزرگوار امام جعفر صادق علیہ السلام تا دم مرگ مجھے سخاوت و خوش اخلاقی کی وصیت فرماتے رہے''۔

بخیل

بخیل وہ شخص ہوتا ہے جو دُوسروں کی امداد کر سکتا ہو مگر جان بوجھ کر نہ کرے۔امام ہفتم کے بیان اور توضیح سے معلوم ہوتا ہے شرعی ذمہ داری کا بوجھ اپنی

گردن سے ہٹانا بخل ہے اور جو بندہ فرائض الٰہی کو ترک کردے وہ بخیل شمار ہوگا۔لہٰذا تمہاری یہ کوشش ہونی چاہئے کہ تم ایسے فرد ہرگز نہ بنو، چونکہ بخل ایک ناپسندیدہ صفت ہے جوانسان کواچھے اعمال کی بجاآوری سے روکتا ہے تبھی تو ایک مؤمن بندہ اس مکروہ صفت سے ہمیشہ دُور رہتا ہے اور کبھی بھی وہ بخل کے ننگ وعار کو قبول نہیں کرتا چونکہ بخیل خدا سے دُور اور اس کے غیض وغضب کے نزدیک ہوجاتا ہے۔۔

بخل انسان کو گھٹیا اور بُرے اعمال بجالانے پر اُبھارتا ہے اور اسے لوگوں کی نظروں میں گھٹیا اور پست بنا دیتا ہے اور رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ یہ شخص معاشرے میں نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔تب جاکر انسان کو احساس ہوتا ہے کہ وہ کتنا اکیلا ہوگیا ہے، اس کا کوئی یار و مددگار نہیں ہے، اس کیلئے موت وزندگی برابر ہوجاتے ہیں۔

﴿البَخیلُ مَنْ بَخِلَ بَمَا افْتَرَضَ اللّٰہُ۔﴾(تحف العقول،ص:۴۰۸)

''بخیل وہ ہے کہ جو کچھ خدا نے اس پر فرض کیا ہے وہ فرض کی ادائیگی میں بخل کرتا ہے''۔

بہترین عبادت

ہمارے آئمہ اطہار علیہم السلام نے متعدد مقامات پر بار بار عبادت کے متعلق گفتگو فرمائی ہے اور اس کی وضاحت بھی فرمائی ہے کہ خدا کی عبادت و بندگی عقل وخرد پر مبنی ہونی چاہئے تاکہ وہ اپنی حقیقی قدر و قیمت پا سکے۔اسی طرح غور وفکر کے متعلق بھی قیمتی ارشادات بیان فرمائے ہیں جن سے مجموعی طور پر مذکورہ مطلب ثابت ہوجاتا ہے۔انسان کو کبھی بھی عبادت کو اتنا سادہ نہیں لینا چاہئے اور بغیر غور وفکر کے ہرگز انجام نہیں دینی چاہئے۔

خداوندکریم نے انسان کو عقل عطا کر رکھی ہے تاکہ وہ اپنی عبادات کے سلسلے میں اس سے استفادہ کرے اور اپنی عبادات کو اہمیت و وقعت دے سکے۔

حضرت موسیٰ ابن جعفر علیہم السلام اس بارے میں حضرت علی ؑ کے قول نقل فرماتے ہیں:

﴿کَانَ أَمِیرُ الْمُؤمِنِینَ عَلَیْہِ السَّلامُ یَقُولُ: ماعُبِدَاللّٰہُ بِشَيءٍ أَفْضَلُ مِنَ الْعَقْلِ﴾(اصول کافی،ج:۱،ص:۱۸)

''امیرالمؤمنین علی ؑ فرماتے ہیں: کوئی عبادت اللہ کے نزدیک افضل نہیں ہوسکتی جو عقل سے انجام نہ دی گئی ہو''۔

دوراہے کے کنارے

ایک مؤمن انسان جو ایمان جیسی دولت سے مالا مال ہوتا ہے وہ اپنے شعور و دانش کے ذریعے صحیح یا غلط راستے یا صحیح ترین اور بدترین راستے کا انتخاب کرتا ہے اور یقین سے اپنی ذمہ داری کا تعین کرتا ہے اور بعید نہیں کہ وہ دوراہے پہ آکھڑا ہو اور بہتر کا انتخاب نہ کرپائے تبھی تو کہتے ہیں کہ یہاں چند معلومات ضروری ہیں جن کی مدد سے وہ بہترین کا انتخاب کرسکے اور اس پہ عمل پیرا ہوسکے اس کی حضرت موسیٰ ؑ ابن جعفر ؑ نے چند علامات بیان فرمائی ہیں:

﴿إذا مَرَّبِكَ أَمْرانِ لاَ تَدْرِي أَيُّهُمَا خَيْرٌ وَأَصْوَبُ،فَانْظُرْ أَيُّهُمَا أَقْرَبُ إلىٰ هَوَاكَ فَخَالِفْهُ، فَإنَّ كَثِيرَالصَّوابِ فِي مُخَالَفَةِ هَوَاكَ﴾ (تحف العقول،ص:۳۹۸)

''جب کبھی تمہیں دو کام پیش آئیں کہ تم نہ جان سکو کہ کون سا کام زیادہ بہتر اور زیادہ صحیح ہے تو فکر سے کام لو اور دیکھو کونسا کام تمہاری ہوا وہوس کے قریب ہے، اُس سے پرہیز کرو اور جو ایمان کے قریب ہو اُسے انجام دو کیونکہ سچائی اور درستگی تمہاری ہوا وہوس کے خلاف ہوگی''۔

شب وروز کا پروگرام

ایک مسلمان کے تمام کام بڑے مرتب اور منظم انداز میں انجام پاتے ہیں، وہ ہمیشہ اپنی زندگی میں نظم وضبط اور ترتیب کا خصوصی خیال رکھتا ہے اور کوئی کام بغیر پروگرام کے انجام نہیں دیتا اور بغیر پروگرام کے کسی کام کو ترک نہیں کرتا۔ہمارے آئمہ اطہار علیہم السلام نے دینی اور آخرت کے کاموں کو انجام دینے کیلئے ایک منظم پروگرام دیا ہے اور ساتھ ہی ہمیں نظم وانضباط کی تشویق بھی دلائی ہے۔

﴿اِجْتَهِدُوا فِي أَنْ يَكُونَ زَمَانُكُمْ أَرْبَعَ ساعَاتٍ :

ساعَةً لِمُناجاتِ اللهِ۔ وَساعَةً لأَمْرِ الْمَعَاشِ۔ وَساعَةً لِمُعاشَرَةِ الاِخْوانِ والثِّقَاتِ، الَّذِينَ يُعَرِّفُونَكُمْ عُيُوبَكُمْ وَيُخْلِصُونَ لَكُمْ فِي

الْبَاطِلِ ۔ وَسَاعَةٌ تُخَلُّونَ فِيهَا لِلَذَّاتِكُمْ فِي غَيْرِ مُحَرَّمٍ، وَبِهٰذِهِ السَّاعَةِ تَقْدِرُونَ عَلَى الثَّلَاثِ سَاعَاتٍ﴾ (تحف العقول،ص:۴۰۹)

''اپنے شب وروز کے اوقات کو چار حصوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کرو:

ایک حصہ عبادت خدا کے لئے، ایک حصہ زندگی کے معاشی امور کے لئے ایک حصہ اپنے دوستوں اوران لوگوں کے ساتھ معاشرت زندگی کے لئے کہ جو قابل اعتماد ہوں کہ جو (تنہائی میں) تمہارے عیبوں اور غلطیوں سے تمہیں آگاہ کریں تاہم دل سے تمہارے مخلص ہوں اور ایک حصہ حلال و جائز لذات کے لئے مخصوص کرواوراس آخری حصہ یعنی لذات حلال سے استفادہ کے ذریعے تم دوسرے تین حصوں پر عمل کرنے کے لئے بھی قادر ہوجاؤ گے''۔

بزرگوار اور کریم النفس

لفظ جواد، جود سے لیا گیا ہے جس کے معنی عظیم، بزرگ، بخشنے والا اور کریم النفس کے ہیں۔لوگوں میں جوکوئی شخص ان صفات کا متحمل ہوگا اسے جواد کہا جائے گا جبکہ خدا کی نسبت اس کی صورت حال ذرا مختلف ہے کہ جس کی وضاحت امام ہفتم علیہ السلام نے یوں فرمائی ہے:

﴿وَسَأَلَهُ رَجُلٌ عَنِ الْجَوَادِ فَقَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ:

اِنَّ لِكَلَامِكَ وَجْهَيْنِ۔ فَاِنْ كُنْتَ تَسْأَلُ عَنِ الْمَخْلُوقِيْنَ، فَاِنَّ الْجَوَادَ، الَّذِي يُؤَدِّي مَاافْتَرَضَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَالْبَخِيلُ مَنْ بَخِلَ بِمَا افْتَرَضَ اللّٰهُ۔ وَاِنْ كُنْتَ تَعْنِي الْخَالِقَ فَهُوَ الْجَوَادُ اِنْ أَعْطٰى وَهُوَ الْجَوَادُ اِنْ مَنَعَ، لِاَنَّهُ اِنْ أَعْطَاكَ، أَعْطَاكَ مَا لَيْسَ لَكَ وَاِنْ مَنَعَكَ مَنَعَكَ مَا لَيْسَ لَكَ﴾ (تحف العقول،ص:۴۰۸)

''ایک شخص نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے جواد یعنی کریم النفس وسخی کی حقیقت کے بارے میں پوچھا تو حضرتؑ نے ارشاد فرمایا: تیرے سوال کی دوصورتیں ہیں: اگر تو نے مخلوقات کے بارے میں پوچھا ہے تو سُن لے کہ کریم النفس (جواد) وہ ہے کہ جو اللہ تعالی نے اس پر جو فرض عائد کیا ہے وہ ادا کرتا ہے اور (اس کے بالمقابل) بخیل وہ ہے جو واجبات خداوندی کی ادائیگی میں لاپروائی وغفلت برتتا ہے اور اگر تیری مراد خالق سے ہے تو سن لے کہ وہ عطا کرے تب بھی جواد ہے اور نعمت روک لے تب بھی جواد ہے کیونکہ اگر وہ تجھے عطا کرتا ہے تو اس لئے کہ اس سے تجھے فائدہ حاصل ہوگا اور جو روک لیتا ہے تو روک لینے میں ہی تیرا فائدہ مضمر ہے (اگر وہ تجھے مل جائے تو تیرے لئے نقصان کا باعث ثابت ہوگا، اس لئے روک لینے میں تیرا فائدہ ہے)''۔

خوشخبری

خوش قسمت ہیں عقلمند اور سوجھ بوجھ رکھنے والے افراد جو اپنی عقل کے ذریعے دُنیا و آخرت کی سعادت حاصل کرلیتے ہیں چونکہ یہ جانتے ہوتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا چاہئے اور کیا کررہے ہیں۔ایسے افراد پہ خدا کا خصوصی لطف وکرم ہوتا ہے اور خداوند کریم کی خصوصی توجہ کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔انہیں نیکیوں کی بشارت دی گئی ہے اوران بشارتوں میں سے ایک یہ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى بَشَّرَ أَهْلَ الْعَقْلِ والفَهْمِ فِي كِتَابِهِ (اصول کافی، ج:۱،ص:۱۳)، فَقَالَ فَبَشِّرْ عِبَادِالَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ اَحْسَنَهُ۔ اُولٰئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللهُ وَاُولٰئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (سورۂ زمر، آیت:۱۹)

''اے پیغمبرؐ! میرے ان بندوں کو بشارت وخوشخبری دیجئے کہ جو بات سنتے ہیں اوراس میں سے سب سے اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ تعالی نے ہدایت کی توفیق دی اور یہی لوگ صاحبان عقل ہیں''۔

پیغمبروں کی بعثت

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے اس فرمان ذیشان میں انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے کہ لوگ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات اور راہنمائی میں اپنے رب کے بارے میں غور وفکر کریں اور اس کی معرفت حاصل کریں اوراس مقصد کو پائیں جو عقلاء ہوتے ہیں اور جتنا زیادہ عقل رکھتے ہوں گے وہ زیادہ سے زیادہ اور جلد از جلد اپنے مقصد کو پالیتے ہیں۔

﴿مَا بَعَثَ اللّٰهُ اَنْبِيَاءَهُ وَرُسُلَهُ اِلٰى عِبَادِهِ اِلَّا لِيَعْقِلُوا عَنِ اللّٰهِ، فَأَحْسَنُهُمْ اسْتِجَابَةً، أَحْسَنُهُمْ مَعْرِفَةً، وَأَعْلَمُهُمْ بِأَمْرِ اللّٰهِ، أَحْسَنُهُمْ

عَقْلاً۔ وَأَكْمَلُهُمْ عَقْلاً أَرْفَعُهُمْ دَرَجَةً فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾(اصول کافی، ج:۱،ص:۱۶)

''خداوندتبارک وتعالیٰ نے اپنے پیغمبروں و رسولوں کواپنے بندوں کی طرف اس لئے بھیجا تا کہ وہ معرفت الٰہی کے سلسلے میں عقل سے کام لیں پس جن کی عقل معرفت خدا کے بارے میں بہتر(و کامل) ہے وہی پیغمبروں کی دعوت کو بہتر طریقے سے قبول کرنے والے ہیں اوراچھی عقل والے ہی دین وحکم خدا کوزیادہ سمجھتے ہیں اور جو زیادہ عقل مند ہوں دنیا و آخرت میں ان کا رتبہ بلند ہوتا ہے''۔

ضرورت کے مطابق عطا

جب انسان یہ سوچنے لگتا ہے کہ اسے بہترین لباس پہننا چاہئے اور عمدہ کھانے کھانا چاہئے، اس کے پاس زندگی کے بہترین وسائل موجود ہونے چاہئے جن کے ذریعے وہ اپنے خاندان کیلئے زندگی بسر کرنے کا سامان کر سکے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا غم زدہ ہونا فضول ہے۔چونکہ خداوندکریم انسان کی مدد کر رہا ہے اور وہ ذات برحق کبھی کسی کو نا اُمید نہیں چھوڑتی اور مصائب و آلام میں بھی وہ ذات ہمیشہ مددگار رہتی ہے۔ کمزور اور ناتواں انسان کو طاقتور بنا دیتی ہے اور انسان کو تحمل و برداشت کی طاقت اور حوصلہ عطا کرتی ہے۔ یہ بھی پروردگار عالم کے فضل وعنایت میں سے ایک ہے کہ جس کو جتنی اور جب ضرورت ہوتی ہے وہ خصوصی لطف وکرم کرتے ہوئے اسے عطا کر دیتی ہے۔

امام ہفتم حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام اس بارے میں ارشادفرماتے ہیں:

﴿وَاللّٰهُ يَنْزِلُ الْمَعُوْنَةَ عَلٰى قَدْرِ الْمَؤُوْنَةِ۔ وَيُنْزِلُ الصَّبْرَ عَلٰى قَدْرِ الْمُصِيبَةِ﴾(تحف العقول،ص:۴۰۳)

''ہرانسان کوخداوندمتعال رزق و مال بقدرضرورت عطا کرتا ہے اورصبرواستقامت بھی مصیبت کے مطابق دی جاتی ہے''۔

بدن کی ارزش و قیمت

انسان میں اصل قیمت اس کی رُوح کی ہوتی ہے جو اسے ایک شخصیت عطا کرتی ہے۔یا تو اسے اعلیٰ مراتب پہ فائز کر دیتی ہے یا پھر اسے پستیوں میں دھکیل دیتی ہے۔البتہ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ انسان کا جسم بے ارزش و بے قیمت ہے۔چونکہ جسم ہی رُوح کیلئے ایک قالب کی حیثیت رکھتا ہے اسے جو کوئی بھی نقصان پہنچائے ضروری ہے کہ وہ اس کی دیت بھی ادا کرے اور جب رُوح جسم سے جدا ہو تو پھر جسم انتہائی عزت واحترام کے ساتھ مٹی میں دفن کر دیا جائے۔

ہماری بحث یہ ہے کہ بالآخر بروز قیامت ہمارے اجسام کہاں جائیں گے؟ اوران سے کیا سلوک کیا جائے گا؟اس کا تعلق دُنیا میں انسان کے طرز زندگی یعنی کردار و رفتار سے وابستہ ہے۔اگر دُنیا میں وہ خدا کے بتلائے ہوئے راستے پر چلتا رہا ہے اور جسم کو غیر شرعی خواہشات سے دُور رکھے رہا ہے اور اس نے خدا سے معاملہ کئے رکھا تو اس کا جسم جنتی نعمتوں کے بدلے فروخت کیا جائے گا اور بروز قیامت انہیں اپنی تحویل میں لے کر جنت میں بھیج دیا جائے گا اور اگر اس دُنیا میں وہ خدا سے دُور رہا ہے اپنی خواہشات اور دُنیاوی لذائذ کے پیچھے بھاگتا رہا ہے اور جسمانی لذائذ کو اس نے آخرت کی جاویدانی لذائذ پہ ترجیح دی ہے تو پھر اس کے جسم کو دوزخ کے عذاب میں ڈال دیا جائے گا۔

اسی لئے امام ہفتم اس چھوٹے سے جملے میں ہمیں تنبیہ فرما رہے ہیں کہ:

''اے انسان تجھ پر حیف ہے کہ اشرف المخلوقات ہو کر پستی میں گر رہے ہو اور اس طرح کے نقصان دہ معاملات میں اُلجھے ہوئے ہو''۔

﴿أَمَا إِنَّ أَبْدَانَكُمْ لَيْسَ لَهَا ثَمَنٌ إِلَّا الْجَنَّةَ۔ فَلَا تَبِيعُوْهَا بِغَيْرِهَا﴾(اصول کافی، ج:۱،ص:۱۹)

''آگاہ رہو کہ تمہارے بدنوں کی قیمت صرف اور صرف جنت ہے پس خبردار! انھیں سوائے بہشت کے کسی اور چیز کے بدلے نہ بیچو''۔

بہترین تقرب کا بہترین وسیلہ

خدا کے نزدیک ہونے اور اس کا قرب حاصل کرنے کے راستے بہت زیادہ ہیں۔اگر انسان مرد میدان عمل ہو پھر تو کام بہت ہیں بلکہ بہت ہی زیادہ ہیں۔خوشنودی خدا پانے اور خدا تک پہنچنے کیلئے اسے کئی کام انجام دینے ہوں گے اور کئی کام چھوڑنے ہوں گے۔ یہ بات کلی طور پر تقریباً سب لوگ جانتے ہیں

اور سب کے علم میں ہے البتہ اس راستے میں کون سی چیزیں انسان کی معاون و مددگار بن سکتی ہیں اور اسے خدا کے زیادہ نزدیک لے جاتی ہیں یہ ہر کوئی نہیں جانتا۔اس سلسلہ میں صرف اہل بصیرت اور اولیاء اللہ ہی اپنی رائے دے سکتے ہیں۔

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ آئمہ معصومین علیہم السلام کے پاس یہ مقام اور اس کی صلاحیت موجود ہے۔یہی وہ ہستیاں ہیں جو انسان کی کلی اور جزوی طور پر ہدایت اور رہنمائی کر سکتی ہیں۔

﴿اَفْضَلُ مٰا یَتَقَرَّبُ بِهِ العَبْدُ اِلَی اللّٰهِ، بَعْدَ المَعْرِفَةِ بِهِ، الصَّلاٰةُ وَبِرُّ الْوالِدَیْنِ وَتَرْکُ الحَسَدِ وَ الْعُجْبِ والفَخْرِ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۱)

”معرفت و شناخت خداوند متعال کے بعد پروردگار سے تقرب و نزدیکی کا بہترین وسیلہ نماز پڑھنا،ماں باپ سے نیکی کرنا اور حسد و خودسری اور کبر و نخوت سے اجتناب کرنا ہے“۔

علم سے استفادہ

قدیم زمانے میں قافلے رات کو سفر کیا کرتے تھے اور اپنا راستہ کھو جانے کے خوف سے وہ ستاروں سے راہنمائی لیتے تھے جن کے ذریعے وہ جہات اربعہ (شمال،جنوب،مشرق،مغرب) کی سمت کا تعین کرتے تھے اور یوں وہ اپنی منزل پہ پہنچ جایا کرتے تھے۔البتہ یہ سارا عمل اس انسان کے لئے ممکن ہوتا جو ستاروں کی چال اور حالات سے آگاہی رکھتا ہوتا اور راہِ سفر کو ان کے مطابق طے کرتا۔

امام موسیٰ ابن جعفر علیہم السلام ایسے افراد کو جو اپنی حکمت و دانش پہ عمل پیرا نہیں ہوتے ہیں مخاطب کر کے فرما رہے ہیں:

”صرف ستاروں کو دیکھنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ستاروں کی شناسائی اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی حرکت کے مطابق سفر کرنا بھی ضروری ہے۔علم و حکمت کے سلسلے میں بھی صرف درس پڑھ لینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے مطابق عمل کرنا بھی ضروری ہے“۔

﴿اِنَّ کُلَّ النّاسِ یَبْصُرُ النُّجُومَ، وَلٰکِنْ لاٰ یَهْتَدِی بِهٰا، اِلاّٰ مَنْ یَعْرِفُ مَجٰارِیَهٰا وَمَنٰازِلَهٰا، وَکَذٰلِكَ اَنْتُمْ تَدْرُسُونَ الحِکْمَةَ وَلٰکِنْ لاٰ یَهْتَدِی بِهٰا مِنْکُمْ اِلاّٰ مَنْ عَمِلَ بِهٰا﴾ (تحف العقول،ص:۳۹۲)

”سب لوگ (ستاروں کو دیکھتے ہیں) لیکن وہی لوگ ان کے ذریعے ھدایت پاتے ہیں کہ جو ستاروں کے راستوں اور منازل سے آگاہ ہیں اسی طرح آپ دانش و حکمت سیکھتے ہیں مگر وہی لوگ جو علم و حکمت پر عمل کرتے ہیں وہی علم و حکمت کے ذریعے نجات و ہدایت پاتے ہیں“۔

لاپروا

جنت کوئی ایسی جگہ نہیں ہے کہ جو چاہے منہ اُٹھائے جنت کی طرف چل پڑے اور اس میں جا کر سکونت اختیار کر لے، بلکہ وہاں رہنے کیلئے انسان کے اندر بہت ساری شرائط کا پایا جانا ضروری ہے تب جا کر وہ خود کو اس مکان کے اہل بنا سکے گا۔تبھی تو خداوند کریم بہت سارے لوگوں کو صرف ان کے کردار کے سبب جنت سے محروم کر دیں گے اور ان پہ جنت کے دروازے ہمیشہ کیلئے بند کر دیئے جائیں گے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے عوامل ہیں کہ جو انسان کو جنت سے محروم کر رہے ہیں۔مسلمہ ہے کہ ایک نہیں بہت سارے ایسے کام ہیں جو انسان کو جنت سے محروم کر دیں گے۔

صرف ایک کام کی طرف امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اپنے خوبصورت مگر مختصر سے فرمان میں ارشاد فرما رہے ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ الْجَنَّةَ عَلٰی کُلِّ فٰاحِشٍ بَذِیٍّ قَلِیلِ الحَیٰاءِ لاٰ یُبٰالِی مٰا قٰالَ وَلاٰ مٰاقِیلَ فِیهِ﴾ (تحف العقول،ص:۳۹۴)

”خداوند متعال نے بہشت حرام قرار دی ہے ہر اس فاحش کو،بدزبان اور بے حیا انسان پر کہ جسے کوئی پروا نہیں وہ کیا کہہ رہا ہے اور اس کے بارے میں کیا کہا جا رہا ہے“۔

بیتابی

جب کسی انسان میں ایمان آتا ہے تو اس کے تمام اعضاء و جوارح حتیٰ کہ اس کی فکر کو بھی مسخر کر لیتا ہے،اس طرح اس کے ذہن میں کبھی بھی خلاف

شرع اور باغیانہ افکار نفوذ نہیں کر پاتے ہیں اور اس کے اعضاء و جوارح سے کوئی خلاف شرع کام انجام نہیں سرزد ہوتا۔جب بھی اس پہ کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو وہ خود کو خدا کی مرضی کے سامنے تسلیم کرلیتا ہے اور اس کے فیصلے کے سامنے راضی ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ صبر و قناعت کو اختیار کرتا ہے اور کوئی ایسا کام جو بے صبری کر زُمرے میں آتا ہو ہرگز انجام نہیں دیتا۔اسی لئے مصیبت زدہ افراد کیلئے خدا نے جو اجر مقرر فرما رکھا ہے (جو ان کیلئے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے محفوظ رہے گا) اگر وہ بے صبری کا مظاہرہ کرے گا تو اپنے اجر کو ضائع کردے گا۔

﴿مَنْ ضَرَبَ بِيَدِهِ عَلٰى فَخِذِهِ أَوْ ضَرَبَ بِيَدِهِ الْوَاحِدِةِ عَلَى الْاُخْرىٰ عِنْدَ الْمُصِيبَةِ، فَقَدْ حَبِطَ أَجْرُهُ﴾ (تحف العقول،ص:۴۰۳)

''جو کوئی مصیبت کے وقت (ناراضگی اور راضی برضا نہ رہتے ہوئے) اپنی ران پر یا اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر مارے اس کا اجر ضائع ہو جاتا ہے''۔

اُمید اور خوف

ایک مؤمن شخص اگر ایک طرف خداوند کریم کے فضل و کرم کا اُمیدوار ہے تو دُوسری طرف اس کے قہر وغضب سے خائف بھی رہتا ہے یعنی وہ خداوند کریم کے لطف و کرم کو اس نظر سے نہیں دیکھتا کہ اس کے کاموں میں بیباکی اور بے خوفی جھلکنے لگے اور وہ خداوند کریم کے قہر و غضب سے اتنا خوفزدہ بھی نہیں ہوتا کہ خدا کے لطف و کرم سے یکسر نا اُمید ہو جائے۔ان دو پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ عذاب کا سبب بننے والے عوامل سے ہمیشہ اجتناب کرتا ہے اور ان کاموں کو جو رحمتِ الٰہی کا سبب بنتے ہیں ہمیشہ بجالاتا ہے البتہ اگر کوئی شخص صرف اُمید اور خوف پہ اکتفاء کرے اور ساتھ ہی گناہوں سے اجتناب نہ کرے اور واجبات کو ادا نہ کرے تو یہ اُمید اور خوف اسے ہرگز فائدہ نہیں دیں گے اور بروز قیامت یہ اس کی کوئی مشکل بھی آسان نہیں کرسکیں گے۔

﴿لاٰ يَكُونُ الرَّجُلُ مُؤْمِناً حَتّٰى يَكُونَ خٰائِفاً رٰاجِياً، وَلاٰ يَكُونُ خٰائِفاً رٰاجِياً حَتّٰى يَكُونُ عٰامِلاً لِمٰا يَخٰافُ وَ يَرْجُوْ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۵)

''ایک شخص اس وقت تک صحیح مؤمن نہیں بنتا جب تک وہ (عذاب الٰہی) سے خائف اور (رحمت الٰہی) کا اُمیدوار نہ ہو اور وہ اس وقت (واقعی) خائف و امیدوار نہیں ہوتا جب تک اُمید و بیم کے پس منظر میں عمل نہ کرے''۔

فہم و فراست

فقہ کا لغوی معنی ''فہم'' ہے۔اصطلاح میں اس علم کو کہا جاتا ہے کہ جس کا رکھنے والا۔احکام اور اوامر الٰہیہ کو ان کے مقرر کردہ اصول وضوابط سے استخراج و استنباط کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ایسے عالم کو فقیہ اور مجتہد کہتے ہیں۔فقیہ خود بھی نجات پاتا ہے اور دوسروں کو بھی نجات دلاتا ہے۔اس کے کام کا ہم عابد و زاہد سے ہرگز مقائیسہ نہیں کرسکتے ہیں چونکہ عابد شخص صرف خود کو ہلاکت سے بچاتا ہے جبکہ وہ دوسروں کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔

﴿تَفَقَّهُوا فِي دِينِ اللّٰهِ ،فَإِنَّ الْفِقْهَ مِفتٰاحُ الْبَصِيرَةِ وَتَمَامُ الْعِبٰادَةِ وَالسَّبَبُ إِلَى الْمَنٰازِلِ الرَّفِيعَةِ وَالرُّتَبِ الْجَلِيلَةِ فِي الدِّينِ وَالدُّنْيٰا وَفَضْلُ الْفَقِيهِ عَلَى الْعٰابِدِ كَفَضْلِ الشَّمْسِ عَلَى الْكَوٰاكِبِ وَ مَنْ لَمْ يَتَفَقَّهُ فِي دِينِهِ لَمْ يَرْضَ اللّٰهُ لَهُ عَمَلاً﴾ (تحف العقول،ص:۴۱۰)

''دین خدا میں فہم و آگاہی حاصل کرو چونکہ احکام الٰہی اور دستورات شرعی کا سمجھنا بصیرت کا چراغ اور عبادات کی تکمیل کا موجب اور دین و دنیا کے بلند و بالا مراتب و مقامات پر فائز ہونے کا سبب ہے اور ایک فقیہ اور احکام الٰہی سے آشنا عالم کی فضیلت ایک عابد پر یوں ہے جس طرح خورشید کی ستاروں پر فوقیت ہے اور جو اپنے دین کا فہم نہ رکھتا ہو خداوند متعال اس کے کسی بھی عمل کو پسند نہیں کرتا''۔

اجر و جزاء

جب بھی انسان پہ کوئی مصیبت آتی ہے تو اس پر غم و اندوہ کے سائے فگن ہو جاتے ہیں۔البتہ وہ خداوند کریم کے نزدیک اجر و جزاء کا مستحق قرار پاتا ہے۔صرف اس کی شرط یہ ہے کہ مصیبت زدہ انسان مصیبت کے مقابلے میں صبر کا دامن نہ چھوڑے تو اسے مقدر کا لکھا اور خدا کی مرضی سمجھ کر خندہ پیشانی سے قبول کرے اور خوشی و رضا اور تحمّل کا مظاہرہ کرے۔

﴿وَالْمُصِيبَةِ لاَ تَكُونُ مُصِيبَةً يَسْتَوجِبُ صَاحِبُهَا أَجْرَهَا اِلاّٰ بِالصَّبْرِ وَالاِسْتِرجَاعِ۔﴾(تحف العقول،ص:۴۰۳)

''کوئی صاحب مصیبت اس مصیبت کے اجر و پاداش کا مستحق نہیں بن سکتا جب تک وہ صبر نہ کرے اور اس صدمہ پر کلمۂ استرجاع نہ کہے''۔

استرجاع سے مراد یہ ہے کہ ﴿انا لله و انا الیه راجعون﴾ (سورۂ بقرۃ:۱۵۶) ''ہم خدا کی طرف سے تھے اور اسی طرف لوٹ کر جانا ہے''۔ جو بندہ یہ جملہ اپنی زبان پہ جاری کرے اور اس پر مکمل ایمان بھی رکھتا ہو تو یہ خدا کے قضا و قدر کو تسلیم کرنے کی علامت ہے، یہ اس نے خدا کے سامنے سر تسلیم کیا ہے۔

پاک و ابرار لوگ

مسلمانوں میں چند افراد ایسے بھی ہیں کہ ایمان جن کے دلوں کی گہرائیوں تک گھر کر چکا ہے، اسی لئے ان کے پاؤں کبھی بھی حق و حقیقت کے راستے سے نہیں ڈگمگاتے ہیں، ان کا ہمیشہ اپنے کردار، گفتار اور رفتار پہ مکمل ضبط و کنٹرول ہوتا ہے۔ ایسے افراد کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:

﴿قَالَ أَمِيرُ الْمُؤمِنِينَ صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَيهِ: اِنَّ لِلّٰهِ عِبَادًا كَسَرَتْ قُلُوبَهُمْ خَشْيَتُهُ فَأَسْكَتَتْهُمْ عَنِ الْمَنْطِقِ، وَاِنَّهُمْ لَفُصَحَاءُ عُقَلاَءُ، يَسْتَبِقُونَ اِلَى اللّٰهِ بِالأَعْمَالِ الزَّكِيَّةِ، لاَ يَسْتَكْثِرُونَ لَهُ الْكَثِيرَ وَلاَ يَرْضَونَ لَهُمْ مِنْ أَنْفُسِهِمْ بِالْقَلِيلِ، يَرَوْنَ أَنْفُسَهُمْ أَنَّهُمْ أَشْرَارٌ وَاِنَّهُمْ لَأَكْيَاسٌ وَأَبْرَارٌ﴾ (تحف العقول،ص:۳۹۴)

''امام موسیٰ کاظم علیہ السلام امام علی امیرالمؤمنین علیہ السلام سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: خداوند متعال کے ایسے بندے بھی ہیں کہ جن کے دل اس کے خوف سے شکستہ اور زبانیں گنگ ہیں نہ اس لئے کہ وہ زبان نہیں رکھتے بلکہ وہ فصیح اور عاقل ترین افراد میں سے ہیں وہ تقرب الٰہی کے لئے نیک اعمال میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرتے ہیں اور اپنے بڑے سے بڑے نیک عمل کو بھی بڑا نہیں سمجھتے اور اپنے معمولی سے نیک کام پر بھی راضی نہیں ہوتے درحالانکہ انتہائی زیرک اور پاکباز ہیں لیکن خیال کرتے ہیں کہ وہ بدکار ہیں یعنی اپنی حالت پر اتراتے نہیں اور مزید نیک اعمال بجالانے کی خواہش رکھتے ہیں''۔

باحیاء شخص

جس شخص کے دل میں ایمان راسخ ہو چکا ہو، ہمیشہ خدا کی یاد اس کے شامل حال رہتی ہے۔ اگر کبھی اسے شیطان فریب دے اور اس سے خواہشات نفسانیہ کی اتباع اور خلاف شرع کاموں کو انجام دینے کی آرزو کرے تو خدا کی یاد اسے ان گھٹیا اعمال کے ارتکاب سے روک دیتی ہے۔ یہ حالت گناہوں سے اجتناب کا نتیجہ ہوسکتی ہے اور اسے علم اخلاق میں ''حیاء'' سے تعبیر کرتے ہیں اور خداوند کریم سے حیاء سبب بنتا ہے کہ باحیاء شخص ہمیشہ پاک و پاکیزہ حالت میں رہتا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ ایک دن تمام موجودات فنا ہو جائیں گے سوائے ذات حق کے۔

اس لئے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام باحیاء شخص کے حق میں دُعا کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿رَحِمَ اللّٰهُ مَنِ اسْتَحيٰى مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ، فَحَفِظَ الرَّأسَ وَمَا حَوٰى، وَالبَطْنَ وَمَا وَعٰى، وَذَكَرَ الْمَوْتَ وَالْبِلٰى﴾(تحف العقول، ص:۳۹۰)

''اللہ رحم کرے اس شخص پر جو خدا سے اس طرح حیاء کرے جیسا حیاء کرنے کا حق ہے پس وہ حفاظت کرتا ہے اپنے سر کی اور جو کچھ سر میں ہے (یعنی اپنی آنکھوں کو حرام سے بچاتا ہے اور باطل افکار سے پرہیز کرتا ہے) اور حفاظت کرتا ہے اپنے شکم کی اور اس چیز کی جو شکم میں ہے (یعنی حرام سے بچتا ہے) اور موت و اپنی بوسیدگی کو یاد رکھتا ہے''۔

والدین

حقوق والدین مسلمہ اور اہم ترین حقوق میں سے ہے۔ اولاد کا حق بنتا ہے کہ وہ اپنے والدین کو ہمیشہ راضی و خوش رکھے اور کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے ان کا دل آزردہ ہو اور کبھی انہیں اولاد سے رنج و الم پہنچے تو اولاد کا کام ہے کہ فوراً اس کا ازالہ کرے اور ان کے قدموں میں خوشیاں نچھاور کردے اور اگر کوئی اولاد ان مسائل کی پرواہ نہ کرے اور اپنے والدین کو ناراض کردے تو گویا اس نے ان کے حقوق کا خیال نہیں رکھا ہے اور ان پر ستم کیا ہے۔ قرآن کریم، پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اطہار علیہم السلام نے حقوق والدین کا خیال رکھنے کا تکراراً سراراً ذکر کیا ہے اور انہیں ادا کرنے کی بہت زیادہ تاکید فرمائی ہے۔ اس بارے میں ہر

قسم کی تاکید فرمائی ہے۔

ہمارے ساتویں امام علیہ السلام نے خوبصورت جملے میں تشریح فرمائی ہے:

﴿مَنْ أَحْزَنَ وَالِدَيْهِ فَقَدْ عَقَّهُمَا﴾ (تحف العقول،ص:۴۰۳)

''جس کسی نے (اپنے فرائض انجام نہ دینے اور نافرمانی کی وجہ سے) اپنے والدین کو غم واندوہ میں مبتلا کیا، گویا اس نے ان کے حق کا کوئی خیال نہ رکھا''۔

پرورشِ حکمت

قرآن حکیم اور احادیث اہل بیت علیہم السلام میں حکمت کے بارے میں متعدد فرامین اور اقوال موجود ہے۔ البتہ حکمت سے مراد رائج الوقت فلسفہ نہیں ہے بلکہ حکمت سے مراد وہ معرفت ہے جو انسان کو اللہ کے نزدیک کر دے لہٰذا اس لحاظ سے ہر بندہ اپنے ذہن میں ایسی حکمت کو جگہ نہیں دیتا بلکہ صرف قبول کرنے والے اور متواضع انسان ہی ایسا کرتے ہیں۔ انہی کے اندر اس گوہر گرانقدر کو پالینے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو خود کو عظیم اور برتر سمجھتے ہیں وہ اس عطیہ خداوندی سے محروم رہتے ہیں۔

﴿اِنَّ الزَّرْعَ يَنْبُتُ فِي السَّهْلِ وَلَا يَنْبُتُ فِي الصَّفَا فَكَذٰلِكَ الْحِكْمَةُ تَعْمُرُ فِي قَلْبِ الْمُتَوَاضِعِ وَلَا تَعْمُرُ فِي قَلْبِ الْمُتَكَبِّرِ الْجَبَّارِ لِأَنَّ اللّٰهَ جَعَلَ التَّوَاضُعَ آلَةَ الْعَقْلِ وَجَعَلَ التَكَبُّرَ مِنْ آلَةِ الْجَهْلِ﴾ (تحف العقول،ص:۳۹۷)

''بیج زرخیز زمین میں اُگتا ہے نہ کہ سنگلاخ جگہ پر، علم وحکمت کا حال بھی ایسے ہی ہے جو متواضع انسان (جو حقائق کو سمجھنے اور قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے) کے دل میں پھلتا پھولتا ہے لیکن متکبر اور مغرور شخص کے دل میں وہ جگہ نہیں پا سکتا چونکہ خداوند متعال نے تواضع کو عقل کا اور تکبر کو جہالت کا ہتھیار قرار دیا ہے''۔

پست وحقیر چیز

وہ چیز جس کا دُنیا دار لوگوں میں بہت زیادہ لالچ پایا جاتا ہے اور اسے پانے کیلئے وہ بہت زیادہ تگ و دو کرتے ہیں وہ چیز الٰہی انسانوں، حقیقت شناس افراد اور آزاد بندوں کے نزدیک بے وقعت اور حقیر شمار ہوتی ہے۔ (ان حقیر چیزوں کے لئے) ان کی بے نیازی اور عدم توجہ کے سبب یہ چیزیں صرف دُنیا پرستوں کیلئے بچ جاتی ہے۔

﴿وَقَالَ عَلِيُّ بْنُ الْحُسَيْنِ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ: اِنَّ جَمِيعَ مَا طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ فِي مَشَارِقِ الأَرْضِ وَمَغَارِبِهَا بَحْرِهَا وَبَرِّهَا وَسَهْلِهَا وَجَبَلِهَا عِنْدَ وَلِيٍّ مِنْ أَوْلِيَاءِ اللّٰهِ وَأَهْلِ الْمَعْرِفَةِ بِحَقِّ اللّٰهِ كَفَيْءِ الظِّلَالِ۔

ثُمَّ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: أَوَلَا حُرٌّ يَدَعُ (هٰذِهِ) اللُّمَاظَةَ لِأَهْلِهَا۔ يَعْنِي الدُّنْيَا۔ فَلَيْسَ لِأَنْفُسِكُمْ ثَمَنٌ اِلَّا الْجَنَّةَ فَلَا تَبِيعُوهَا بِغَيْرِهَا، فَإِنَّهُ مَنْ رَضِيَ مِنَ اللّٰهِ بِالدُّنْيَا فَقَدْ رَضِيَ بِالْخَسِيسِ﴾ (تحف العقول،ص:۳۹۱)

''امام موسیٰ کاظم علیہ السلام، امام زین العابدین علیہ السلام سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: زمین کے مغرب ومشرق، بحر و بر، دشت وکوہ کی ہر وہ شی کہ جس پر سورج کی شعاعیں پڑتی ہیں خواہ وہ سمندر ہوں یا خشکی، صحرا ہوں یا پہاڑ اولیائے خدا میں سے ایک ولی اور ایک عارف بالحق کے نزدیک ان کی حیثیت ایک ''سایہ'' سے کم نہیں پھر آپ نے فرمایا:

کیا کوئی ایسا آزاد مرد ہے کہ جو اس ناچیز و پست شی یعنی دنیا کو اس کے طلبگاروں کے لئے چھوڑ دے؟ تمہاری ذات کی قیمت سوائے جنت کے اور کچھ بھی نہیں پس اپنے آپ کو کسی پست چیز (یعنی دنیا) کے بدلے فروخت نہ کرو اگر کوئی صرف اس دنیا کے لئے خدا سے راضی ہو جائے تو وہ بہت ہی حقیر بے ارزش چیز پر راضی ہوا ہے''۔

آئمہ اطہارؑ کے پیروکار

مکتب اہل بیت علیہم السلام کے حقیقی پیروکار درحقیقت معاشرے کی کریم کہلواتے تھے جو اپنے امام ؑ کے راستے کی کما حقہ معرفت رکھتے تھے اور ہر زمانے میں اپنے امام ؑ کی معرفت کامل رکھتے تھے۔ایسے افراد امتیازی خصوصیات اور منفرد صفات کے حامل ہوتے تھے۔یہ آئمہ اطہار علیہم السلام کے ہاں درجہ قبولیت پہ فائز ہوتے تھے۔چونکہ یہ آئمہ اطہار علیہم السلام کے تمام فرامین پہ عمل پیرا ہوتے تھے پس جو بندہ بھی دعویدار ہے کہ وہ آئمہ اطہار علیہم السلام کے پیروکار ہے اسے اپنے آپ کو ان فضائل سے آراستہ کرنا ہوگا جو آپؑ کے اصحاب کا طرہ امتیاز تھا۔

انہی صفات میں سے ایک صفت کو ساتویں امام ؑ کچھ اس طرح بیان فرماتے ہیں:

﴿لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يُحَاسِبْ نَفْسَهُ فِي كُلِّ يَوْمٍ فَإِنْ عَمِلَ حَسَناً، اسْتَزَادَ مِنْهُ، وَإِنْ عَمِلَ سَيِّئاً اسْتَغْفَرَ اللّٰهَ مِنْهُ وَتَابَ إِلَيْهِ﴾ (تحف العقول،ص:۳۹۶)

’’وہ شخص ہمارے پیروکاروں میں سے نہیں ہے کہ جو ہر روز اپنے نیک و بد اعمال کا حساب نہ کرے پس اگر اس نے کوئی نیک عمل انجام دیا ہو تو اس میں مزید اضافہ کرے اور اگر اس سے کوئی بدعمل سرزد ہوا ہو تو وہ خداوند متعال سے اس بدی کی معافی مانگے اور توبہ کرے‘‘۔

سودمند تجارت

عقلمند شخص ہمیشہ اپنی عقل کی راہنمائی میں کوشش کرتا ہے تا کہ معنویات سے مکمل مستفید ہو سکے اور مادیات کا کم سے کم پیچھا کرے اور اس کی نگاہیں دُنیا کے حُسن و جمال پہ ٹھہر ہی نہ جائیں کبھی بھی معنویات کو ترک نہ کرے اور انہیں فراموشی کے سپرد نہ کر دے۔اس لئے وہ معرفت و آگاہی اور حقائق شناسی کے لئے دوسروں سے زیادہ کوشاں رہے اور جو اسے حضرت حق تک پہنچائیں۔اس طرح وہ ایمان اور خلوص کی راہ پہ چلتا رہے اور ہمیشہ خدا کی ذات پہ توکل اور اعتماد کرتا رہے اور دُنیاوی معاملات سے وہ بڑی مہارت سے آنکھیں پھیر لیتا رہے،تبھی تو دُنیا سے ان کا حصہ بہت تھوڑا بنتا ہے،اس بات پر وہ پریشان نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار کرتا ہے۔

﴿إِنَّ الْعَاقِلَ رَضِيَ بِالدُّونِ مِنَ الدُّنْيَا مَعَ الْحِكْمَةِ وَلَمْ يَرْضَ بِالدُّونِ مِنَ الْحِكْمَةِ مَعَ الدُّنْيَا فَلِذٰلِكَ رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ﴾ (اصول کافی،ج:۱،ص:۱۷)

’’عقل مند انسان حکمت و دانش کی وجہ سے تھوڑی سی دُنیا پر راضی (قانع) رہتا ہے تاہم وہ گھٹیا دُنیا کی فراوانی کے بدلے حکمت و دانائی کے نقصان پر راضی نہیں ہوتا اس لحاظ سے ایسے افراد کی تجارت سودمند ہے‘‘۔

راضی برضائے الٰہی

خدا شناسی ایک عظیم مقام ہے،جس بندے کو یہ توفیق حاصل ہوتی ہے وہی اس عظیم درجے پہ فائز ہوتا ہے اور اس کے تمام افکار دگرگوں ہو جاتے ہیں۔وہ حوادثِ زمانہ کو اپنی آنکھوں کے گوشے کے ایک نئے زاویے سے دیکھتا ہے اور جو بندہ ہنوز اس درجے تک نہ پہنچا ہو وہ ہمیشہ خدا سے شکوہ کرتا ہے اور خود کو مقروض سمجھتا ہے اور ہمیشہ یہی سوچتا رہتا ہے کہ خدا اسے کم رزق عطا کرتا ہے یا جو حادثہ اسے پیش آیا ہے وہ اسے پیش نہیں آنا چاہئے تھا اور جن لوگوں نے اپنی تمام فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اور انسانی ادراک کی ممکنہ حدود تک خدا کی معرفت حاصل کرلی ہے۔ان کا طرز فکر ایسا نہیں ہوتا اور نہ ہی کبھی اپنی زبان پہ وہ اس طرح کے جملے ادا کرتے ہیں۔یہ لوگ بہت جلد راضی ہو جانے والے ہوتے ہیں اور خواہشات کے مقابلے میں ہمیشہ تسلیم و راضی برضا رہتے ہیں۔

﴿يَنْبَغِي لِمَنْ عَقَلَ عَنِ اللّٰهِ أَنْ لَا يَسْتَبْطِئَهُ فِي رِزْقِهِ وَلَا يَتَّهِمَهُ فِي قَضَائِهِ﴾(اصول کافی،ج:۲،ص:۶۱)

’’جو خدا کی معرفت بذریعہ عقل حاصل کرتا ہے وہ اللہ کی طرف سے رزق پہنچنے میں دیر ہونے کا قائل نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کے قضا و قدر کے بارے میں کوئی بدگمانی رکھتا ہے‘‘۔

علم وعظمت

اہل بیت علیہم السلام پیغمبر اکرمؐ جو آپؐ کی مسند جانشینی پر فائز ہیں اور ہم با قاعدہ دلائل کی روشنی میں ان کے مقام ومنزلت کی معرفت بھی رکھتے ہیں جس کے وہ اہل ہیں اور انہیں اپنا رہبر و پیشوا بھی مانتے ہیں اور ان پر ایمان کامل بھی رکھتے ہیں، اُنہوں نے کوئی ایسی بات نہیں چھوڑی جو کہنے کے قابل ہو اور اُنہوں نے نہ کہی ہو۔اس مقام پر ہمارے ساتویں پیشوا، ہادی ایک انتہائی اہم اور لطیف نکتے کی بڑے خوبصورت پیرائے میں تفسیر وتشریح فرما رہے ہیں اور وہ اس جہت سے کہ: ''ہر انسان کے کندھے پہ عالم اور جاہل کے مقابلے میں دو یکسر مختلف قسم کی ذمہ داریاں آ جاتی ہیں، انسان کیلئے ضروری ہے کہ وہ عالم کا احترام کرے اور اسے اس علم وفضیلت کی دلیل سے جو اس میں پائی جاتی ہے کے سبب اس کی عظمت و بزرگی کا اعتراف کرے اور اس کے علم سے استفادہ کرے البتہ اس سے بحث وتمحیص سے گریز کرے اور ہمیشہ کچھ پالینے اور ادراک کیلئے خود کو آمادہ رکھے البتہ اِن کے درمیان ہونے والی بحث میں صرف تحقیق وجستجو اور ادراک کی غرض شامل ہونی چاہئے جبکہ جاہل و نادان کو کسی بھی صورت میں عزت واحترام کے لائق نہ سمجھے اور اسکی عزت واحترام سے ہمیشہ اجتناب کرے تا کہ اس طرح جاہل اور عالم کے درمیان فرق رکھا جا سکے۔البتہ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ جاہل کو بالکل دھتکار دیا جائے اور اسے کسی خاطر میں نہ لایا جائے بلکہ اسے اپنی طرف مائل کرلے اور آہستہ آہستہ بتدریج علم کے قریب لانے کی کوشش کرے''۔

﴿عَظِّمِ الْعَالِمَ لِعِلْمِهِ وَدَعْ مُنَازَعَتَهُ وَصَغِّرِ الْجَاهِلَ لِجَهْلِهِ وَلَا تَطْرُدْهُ وَلٰكِنْ قَرِّبْهُ وَعَلِّمْهُ﴾ (تحف العقول،ص:۳۹۴)

''عالم کو ہمیشہ بڑا شمار کرو اور اس سے بحث وتمحیص اور اُلجھاؤ پیدا نہ کرو اور جاہل کو ہمیشہ چھوٹا اور نادان شمار کرو البتہ اسے اپنے آپ سے دُور نہ کرو بلکہ اسے اپنے قریب لاؤ اور جو وہ نہیں جانتا اسے اس کی تعلیم دو''۔

تعلیم وتعلم

آپ جب بھی کسی انسان کو دیکھیں کہ اس کے پاس معلومات بھی ہوتی ہیں اور وہ کئی معلومات سے بے خبر بھی ہوتا ہے یعنی وہ بہت سی چیزوں کو جانتا ہے اور بہت سی چیزوں کو نہیں بھی جانتا ہے۔یعنی انسان پہ اپنی معلومات اور عدم معلومات کے حوالے سے دو قسم کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں: ایک ذمہ داری اس کی اپنی بے خبری کی نسبت سے ہے کہ اسے اپنی توانائیاں صرف کرکے ممکنہ حد تک جس چیز کو نہیں جانتا ہے جاننا چاہئے اور جہالت و نادانی کو اپنے آپ سے دُور کرے تا کہ کمال تک پہنچ سکے۔معلومات کے لحاظ سے اس کا فریضہ اور ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے علم کو دوسروں تک پہنچائے، انہیں سکھائے اور انہیں فیضیاب کرے، یوں وہ اپنے فریضے کی انجام دہی کے ضمن میں خدا کی عطا کردہ استعداد اور علم و دانش جیسی نعمت کا شکریہ بھی بجالا سکے گا۔

امام ہفتم حضرت موسیٰ ؑ ابن جعفر ؑ اس مفہوم کو ایک مختصر مگر فصیح ترین جملے میں یوں بیان فرماتے ہیں:

﴿تَعَلَّمْ مِنَ الْعِلْمِ مَا جَهِلْتَ وَعَلِّمِ الْجَاهِلَ مِمَّا عَلِمْتَ﴾ (تحف العقول،ص:۳۹۴)

''جس چیز کا تمہیں علم نہیں وہ سیکھو اور جو علم رکھتے ہو وہ نہ جاننے والوں اور بے خبروں کو سکھلاؤ''۔

غور وفکر کرنا

جیسا کہ آپ جانتے ہیں اسلامی منطق کی رُو سے تفکر و تدبر کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے حتیٰ کہ اسے عبادات میں شمار کیا گیا ہے۔غور وفکر سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے دماغ سے کام لے اور عالم ہستی اور اس کی موجودات کے بارے میں سوچ بچار کرے تا کہ وہ خدا کے وجود کا سراغ لگا سکے۔گذشتہ قوموں کے بارے میں غور وفکر کرے اور ساتھ ہی اپنی زندگی میں رونما ہونے والے حادثات کا بھی تجزیہ وتحلیل کرے تا کہ ان کی مجموعی روشنی میں اپنی زندگی کیلئے صحیح راستے کا انتخاب کرسکے اور وہ مزید غلطیوں سے خود کو محفوظ رکھ سکے۔

آپ کو جان لینا چاہئے کہ اس کام یعنی غور وفکر اور سوچ و بچار کیلئے بھی انسان کو با قاعدہ تیاری کی ضرورت ہوتی ہے اور مسلم ہے کہ یہ آمادگی تب ہی ممکن ہو سکے گی جب انسان خاموشی اختیار کرے اور سوچ و بچار کی وادی میں قدم رکھے، چونکہ دوران گفتگو انسان سوچ و بچار نہیں کرسکتا۔مقصد یہ ہے کہ انسان

اپنا سارا وقت گفتگو اور بول چال میں نہ گزارے بلکہ سوچ و بچار اور غور و فکر کیلئے بھی اس کے پاس تھوڑا سا وقت مخصوص ہونا چاہئے اور وہ وقت بالکل خاموشی سے گزارے۔

﴿إِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ دَلِيلًا وَ دَلِيلُ الْعَقْلِ التَّفَكُّرُ وَ دَلِيلُ التَّفَكُّرِ الصَّمْتُ۔﴾ (اصول کافی، ج:۱،ص:۱۶)

''ہر چیز کیلئے ایک دلیل اور راہنما ہوتا ہے، عقل مند کی دلیل تفکر ہے اور تفکر کی دلیل خاموشی ہے''۔

خود کو چھوٹا یا کم سمجھنا

اخلاق رذیلہ میں سے ایک چیز عُجب (خودسری، گھمنڈ) ہے۔ عُجب کا ترجمہ کبھی خودسری بھی کرتے ہیں یعنی انسان اپنے اندر پائے جانے والی فضیلت اور ہنرمندی کی وجہ سے بڑا پن ظاہر کرنے لگتا ہے۔ اس عُجب (خودسری) کے درج ذیل بُرے نتائج ہوتے ہیں:۔

(۱) اس کا انجام تکبر پہ جا کر ہوتا ہے۔

(۲) اس کی وجہ سے انسان گناہوں کو فراموش کر دیتا ہے اور ان کی روک تھام کے سلسلے میں کوئی اقدام نہیں کرتا۔

(۳) اپنی عبادات کو بھی زیادہ شمار کرنے لگتا ہے اور انہیں ان کی آفات سے بچانے کی تدبیر نہیں کرتا۔ لگتا ہے یہ بات سب کو معلوم ہے کہ جو بندہ عبادات کی آفات کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اس کے اعمال پُرخلوص اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے۔

بنابرایں انسان اپنے آپ کو ہمیشہ خداوند کریم کی بارگاہ میں حقیر اور چھوٹا سمجھے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے فرمایا:

﴿لَا تُخْرِجَنَّ نَفْسَكَ مِنَ التَّقْصِيرِ فِي عِبَادَةِ اللّٰهِ وَ طَاعَتِهِ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُعْبَدُ حَقَّ عِبَادَتِهِ۔﴾ (تحف العقول، ص:۴۰۹)

''خدا کی اطاعت و عبادت میں کوتاہی اور تقصیر کے سبب اپنے آپ کو مبرّا نہ سمجھو چونکہ خداوند کریم جس لائق ہے اس طرح اسکی عبادت نہیں ہوتی''۔

غرور و تکبر

جب بھی ہم لفظ تکبر یا متکبر سنتے ہیں تو ایک خاص کیفیت یا پھر کسی متکبر شخص کی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے، مثلاً جو شخص کسی کو راہ چلتے سلام نہ کرے یا دوسروں کا احترام نہ کرے یا دوسروں کے سلام کا صحیح جواب نہ دے وہ متکبر کہلوا تا ہے۔ بیشک یہ شخص بھی متکبر کہلوا تا ہے مگر تکبر کے اس سے بھی وسیع تر معانی موجود ہیں اور اس سے مراد وہ تکبر ہے جو خالق کے مقابلے میں اور مخلوق کے مقابلے میں کیا جاتا ہے۔ مخلوق کے ساتھ تکبر کی مثالیں وہی ہیں جنہیں ہم ذکر کر چکے ہیں، البتہ خدا کے ساتھ تکبر سے مراد یہ ہے کہ انسان خدا کی عبادات کے سلسلے میں تکبر کرے اور اپنے آپ کو خدا کے سامنے حقیر و پست محسوس نہ کرے اور اس کے حضور سر تسلیم خم نہ کرے اور خدا کے اوامر و نواہی کو خاطر میں نہ لائے۔

اس بارے میں خداوند کریم کا ارشاد ہو رہا ہے:

﴿وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ﴾ (سورۂ غافر، آیت:۶۰)

''تمہارے رب نے کہا مجھے پکارو میں تمہیں جواب دُوں گا جن لوگوں نے میری عبادت (دُعا) سے تکبر کیا وہ ذلت و رسوائی کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے''۔

ساتویں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام تکبر کے متعلق فرماتے ہیں:

﴿إِيَّاكَ وَ الْكِبْرَ فَإِنَّهُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ كِبْرٍ۔﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۶)

''تکبر سے اجتناب کرو، جس شخص کے دل میں ایک دانہ جتنا بھی تکبر ہوا وہ جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا!''۔

جاہلانہ کوشش

عقل مند اور دانا شخص کے تمام کام ہمیشہ عقل و دانائی کی روشنی میں انجام پاتے ہیں۔ وہ جو عمل بھی انجام دیتا ہے اسے مکمل آداب و شرائط کے ساتھ انجام دیتا ہے اگر چہ اس کا عمل کم اور تھوڑا ہی کیوں نہ ہو مگر اس کے باوجود اس کی ایک قدر و قیمت ہوتی ہے اور خداوند کریم کے ہاں وہ قابل قبول اعمال میں شمار ہوتا ہے۔ چونکہ وہ اپنے اس تھوڑے سے عمل کو معرفت اور بصیرت کے ساتھ انجام دیتا ہے اس کی نیت میں نیت قربت شامل ہوتی ہے۔ وہ ریا کاری اور نمود و نمائش سے مکمل اجتناب کرتا ہے جبکہ خواہشات نفسانیہ کی پیروی کرنے والا اور ناداں شخص ایسا ہرگز نہیں کرتا، وہ اپنی جہالت کے سبب ضروری آگاہی نہیں رکھتا۔ وہ یہ تک نہیں جانتا کہ اِسے کون سا عمل انجام دینا چاہئے! اس کی عبادت کی اساس اور بنیاد سُستی و کوتاہی پہ مبنی ہوتی ہے، وہ عبادات کو بھی اپنی خواہشات کی خاطر انجام دیتا ہے لہٰذا یہ عبادات حکم خدا اور تقرب خدا کے قصد سے یکسر خالی ہوتی ہیں جس کی وجہ سے اس کا عمل اپنی قدر و قیمت کھو دیتا ہے۔

امام ہفتمؑ ایک چھوٹے سے جملے میں اس حقیقت کو یوں بیان فرماتے ہیں:

﴿قَلِيْلُ الْعَمَلِ مِنَ الْعَالِمِ مَقْبُوْلٌ مُضَاعَفٌ وَ كَثِيْرُ الْعَمَلِ مِنْ أَهْلِ الْهَوىٰ وَالْجَهْلِ مَرْدُوْدٌ﴾ (اصول کافی، ج:۱،ص:۱۷)

''جاننے والے (عالم) سمجھدار کا تھوڑا عمل بھی قبول کیا جائے گا اور اس کا اجر دُگنا ہوگا جبکہ خواہشات پرست اور جاہل شخص کا بہت زیادہ عمل بھی قبول نہیں کیا جائے گا''۔

تلافی یا احساس تشکر

انسان اس دنیا میں نہ صرف تنہا زندگی نہیں بسر کرسکتا اور معاشرے کے دوسرے افراد سے کٹ کر نہیں رہ سکتا بلکہ یہ انسان سلسلۂ حیات کو جاری رکھنے کیلئے دوسروں کی مدد کا بھی محتاج ہوتا ہے اور ایک نکتے پر پہنچ کر یہ عدد وسیع اور کلی صورت اختیار کر لیتا ہے جیسے ایک گندم اس کو کاشت کرنا پھر صاف کرنا، آٹا بنانا پھر اسے پکانے کیلئے وہ تندور چی اور نانبائی کی ضرورت اور اس قسم کے بہت سارے کاموں کی انجام دہی کے سلسلے میں انسان مجبور اور محتاج ہوتا ہے کہ معاشرے کے دوسرے افراد کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اور قدم سے قدم ملا کر چلے۔ اور یہ مدد کبھی اس حد کو بھی پہنچ جاتی ہے کہ ایک ذاتی اور انفرادی مسئلے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ باالفاظ دیگر کلی اور عمومی حالت سے بلند ہو کر نیکی اور بھلائی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس نکتے پہ پہنچ کر انسان پہ حکم عقل کے مطابق اس احسان اور محبت کے بدلے میں ایک ذمہ داری اور فریضہ بھی آپڑتا ہے جس سے رُوگردانی ناممکن ہو جاتی ہے، البتہ یہ ممکن ہے فریضہ دو صورتوں میں انجام پائے اس طرح کہ پہلے درجے پہ اس احسان کا بدلہ چکایا جائے اور دوسرے درجے پہ اپنے محسن کا شکریہ بجا لایا جائے۔

﴿اَلْمَعْرُوْفُ غُلٌّ لَا يُفَكُّهُ إِلَّا مُكَافَاةٌ أَوْ شُكْرٌ﴾۔ (سفینۃ البحار، ج:۲،ص:۱۷۸)

''نیکی ایک زنجیر میں بندھی ہوتی ہے جسے بدلے اور شکریئے کے ذریعے ہی کھولا جا سکتا ہے''۔

تنہائی

ایک مسلمان کا فریضہ اور ذمہ داری ہے کہ وہ عام لوگوں کے درمیان اور معاشرے میں زندگی بسر کرے اور مسلمانوں کے اجتماعات میں شرکت کرے، مسجد میں جائے، مریضوں کی عیادت کرے، تشیع جنازہ کیلئے جائے، ان کے فاتحہ خوانی کی محافل میں شرکت کرے، اسے جو دعوتیں دی جائیں اِن میں شرکت کرے اور اگر اسے کوئی اجتماعی ذمہ داری سونپی جائے جسے وہ بخوبی انجام دے سکتا ہے تو اسے قبول کرے اور اگر از خود محسوس کرے کہ وہ کوئی خدمت انجام دے سکتا ہے تو پھر اس خدمت کو انجام دینے کیلئے عملی اقدامات کرے۔ امر بالمعروف اور نہی از منکرات کرے اور اپنی باری پہ معاشرے اور اس کی اقدار کی اصلاح کیلئے ہر ممکن کوشش کرے۔ برائی اور مفاسد کا ڈٹ کر مقابلہ کرے اور اپنی دوستی کیلئے ہمیشہ مؤمن اور متقی افراد کا انتخاب کرے۔

اگر کسی شخص کو دوستی اور محافل کیلئے صالح اور متقی افراد میسر نہ ہوں تو پھر تنہائی ہے چونکہ بُرے اور دنیا دار افراد کی محفل اور مجلس نشینی انسان کو خدا اور آخرت سے دُور کر دیتی ہے اور شہوات پرستی اور مادیت کی طرف راغب کر دیتی ہے اس سے تنہائی بہتر ہے۔ آئمہ اطہار علیہم السلام کی بھی تنہائی و گوشہ نشینی سے مراد ایسی ہی تنہائی ہے۔

﴿اَلصَّبْرُ عَلَى الْوَحْدَةِ عَلَامَةُ قُوَّةِ الْعَقْلِ فَمَنْ عَقَلَ عَنِ اللّٰهِ اعْتَزَلَ أَهْلَ الدُّنْيَا وَالرَّاغِبِيْنَ فِيْهَا وَ رَغِبَ فِيْمَا عِنْدَ اللّٰهِ وَ كَانَ اللّٰهُ

انّسُهُ فِی الْوَحْشَۃِ وَ صَاحِبُہُ فِی الْوَحْدَۃِ وَ غِناهُ فِی الْعَیْلَۃِ وَ مُعِزَّہٗ مِنْ غَیْرِ عَشِیْرَۃٍ۔﴾ (اصول کافی، ج:۱،ص:۱۷)

''تنہائی پہ صبر قدرتِ عقل کی نشانی ہے جو بندہ معرفت خدا رکھتا ہو اہل دنیا اور جو لوگ دنیا (مادہ پرستی) کی طرف مائل ہیں سے دُوری اختیار کرتا ہے اور وہ مائل ہوتا ہے ان چیزوں کی طرف جو خدا کے پاس موجود ہیں تبھی تو خدا تنہائیوں کی وحشتوں میں اس کا مونس و رفیق ہوتا ہے اور تنہائیوں میں اس کا ہم نشین ہوتا ہے اور خدا اس دن سے جس دن ہر کوئی محتاج ہو گا اسے بے نیاز کر دے گا اور بے کسی کے لحات میں اسے عزیز رکھے گا''۔

عاجزی اور انکساری

تواضع کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کیلئے کسی قسم کی عظمت و بڑائی کا قائل نہ ہو۔تواضع تکبر کی ضد ہے چونکہ متکبر شخص اپنے آپ کو دوسروں سے برتر و اعلیٰ سمجھتا ہے۔ایک مؤمن اور عارف شخص جتنی غور و فکر کرے اپنے اندر وہ کوئی ایسی چیز نہیں پاتا جس کے ذریعے اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا اور طاقتور محسوس کر سکے بلکہ وہ اپنے آپ کو اپنے خالق اور اس کی مخلوق کے مقابلے میں ایک حقیر سا ذرّہ اور کمزور ترین چیز سمجھنے لگتا ہے اور خود سے کہتا ہے: (میں کس چیز پہ اُتراؤں اور کس چیز پہ فخر و مباہات کروں؟)۔جبکہ ایک متکبر شخص اپنے آپ کو (اور اپنی طاقت و دولت) کو اپنی بڑائی کا عامل شمار کرتا ہے اور خود کو دوسروں سے برتر سمجھتا ہے وہ یہ نہیں سوچتا کہ جن چیزوں کو اپنے تکبر کا سبب شمار کر رہا ہے یہ اسی خدا کی عطا کردہ ہیں، اسی رب نے اس کو عطا کر رکھی ہیں، یہ طاقت و قدرت بھی اسی رب کی عطا کردہ ہے۔

﴿مَا مِنْ عَبْدٍ اِلاَّ وَ مَلَکٌ اٰخِذٌ بِنَاصِیَتِہٖ فَلَا یَتَوَاضَعُ اِلاَّ رَفَعَہُ اللّٰہُ وَ لَا یَتَعَاظَمُ اِلاَّ وَضَعَہُ اللّٰہُ۔﴾ (تحف العقول،ص:۳۸۶)

''کوئی بندہ ایسا نہیں ہے کہ جس پہ پروردگار کی جانب سے ایک نگران فرشتہ مقرر نہیں کیا گیا ہو، وہ جب بھی نیچے گرنے لگتا ہے خدا اس کو رفعتیں عطا کر دیتا ہے اور جب وہ گردن اکڑا کر رکھتا ہے تو خدا ہی اِسے پستیاں دیتا ہے''۔

یہاں تین اہم نکات توجہ طلب ہیں: اعتصام، توکل، نفس کے خلاف جہاد۔

اعتصام:

یعنی خدا کی طرف جانا، خدا سے پناہ مانگنا، خدا سے تمسک کرنا اور خدا کو ہی اپنا ملجاء و ماوا قرار دینا۔اگر ایک انسان کو یہ توفیق حاصل ہو اور وہ اپنے اندر ایسی حالت پیدا کر لے تو وہ یقیناً نجات یافتہ اور کامیاب و کامران افراد میں شمار ہو گا۔

خداوند کریم کا ارشاد ہو رہا ہے:

﴿وَ مَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰہِ فَقَدْ ھُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾ (سورۂ آل عمران، آیت:۱۰۱)

''جو بندہ خدا کی پناہ میں چلا جائے گویا اِسے راہِ راست کی ہدایت کر دی گئی''۔

توکل:

یعنی اپنے امور کو خدا کی ذات پہ چھوڑ دینا یعنی جو کچھ خداوند کریم چاہیں گے اور میرے لئے پسند کریں گے، میرے مقدر میں لکھ دیں گے اور انسان انہیں قبول کر لے اور ساتھ ہی اپنے آپ کو خدا کی رضا میں فنا و محو کر دے۔

نفس کے خلاف جہاد

نفس سے مراد نفس امارہ کے خلاف جہاد کرنا ہے جو مؤمن انسان چاہتا ہے کہ اس کے معنوی مراتب بلند ہو جائیں اور وہ اپنے باطن کو صاف کرنا چاہتا ہے اور خود کو تباہی و بربادی سے بچانا چاہتا ہے تو اس فریضہ پہ عمل پیرا ہو کر ہمیشہ اپنی نفسانی خواہشات کی حوصلہ شکنی کے ساتھ ساتھ انہیں منفی جواب دے۔

﴿عَلَیْکَ بِالْاِعْتِصَامِ بِرَبِّکَ وَالتَّوَکُّلِ عَلَیْہِ وَ جَاھِدْ نَفْسَکَ لِتَرُدَّھَا عَنْ ھَوَاھَا فَاِنَّہٗ وَاجِبٌ عَلَیْکَ کَجِھَادِ عَدُوِّکَ۔﴾ (تحف العقول،ص:۳۹۹)

''تمہارے اُوپر لازم ہے کہ خدا کی پناہ لو اور ذات اقدس سے توسّل کرو اور اس ذات اقدس پہ توکل کرو اور اپنے نفس امارہ کے خلاف جہاد کرو تاکہ اسے اس کی ہوا و ہوس سے روکے رکھو یہ جہاد ایسے ہی ہے جیسے تمہارے اُوپر دشمن سے مقابلہ کرنا واجب ہے''۔

کمزوروں کا جہاد

جیسے ہم وضاحت کریں گے کہ جہاد اپنی مخصوص شرائط کے ساتھ ہر فرد پر واجب ہے، چاہے وہ طاقتور ہو یا ضعیف۔ طاقتور شخص پہ جہاد اس وقت واجب ہو گا جب تمام تقاضے اور شرائط پوری ہو رہی ہوں، تب جا کر وہ مقابلے کیلئے قدم اُٹھائے گا اور میدان جنگ میں حاضر ہو کر راہِ خدا میں قتل کرے گا یا قتل ہو جائے گا جبکہ ایک ضعیف و ناتواں شخص کا جہاد میدان کارزار میں نہیں ہو گا اور نہ ہی اس پر جہاد کی حدود و شرائط کا اطلاق ہو گا۔ جسمانی طور پر ناتواں شخص کا جہاد یہ ہے کہ وہ مستطیع ہونے کی صورت میں مکۃ المکرّمہ کی زیارت سے شرف یاب ہو اعمال حج کو بجا لائے مگر بات یہاں پہ ختم نہیں ہوتی بلکہ ضروری ہے کہ وہ جہاد کے معیار کو مدنظر رکھے اور جہاد کرنے والے شخص کی طرح مقابلہ کیلئے ہاتھ اُٹھائے جس طرح میدان جنگ میں ایک مجاہد دشمن کو نیست و نابود کرنے کیلئے حملہ کرتا ہے اور اسے پچھاڑتا ہے۔ اس مجاہد کا بھی سفرِ حج کے دوران اگر اپنے عقیدے کے دشمن سے واسطہ پڑ جائے تو اس پہ اپنے صحیح عقائد کو اسی انداز میں پیش کرے۔ روشن خیالی اور وسعت قلبی سے کام لے کر اپنے صحیح عقائد کو راسخ اور قائم کرے اور دشمنوں کی باطل آراء کو غلط قرار دے جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اطہار علیہم السلام سفرِ حج کے دوران لوگوں کے سامنے حقائق کو بیان کرتے تھے اور ان کے دلوں سے باطل مسالک اور زنگ آلود توہمات کو صاف کرتے تھے۔

﴿اَلْحَجُّ جِهَادُ كُلِّ ضَعِيفٍ﴾ (تحف العقول، ص:۲۰۳)

''حج ہر ناتواں و کمزور شخص کا جہاد ہے''۔

جہاں خواری اور جہاں بینی

ابتداء سے ہی لوگوں کی دو قسمیں چلی آ رہی ہیں جو دو متضاد منزلوں کے مسافر ہیں۔ ایک وہ گروہ ہے جو دنیا اور مادیات کا گرویدہ ہے، اس کا ہدف و مقصد صرف مال دنیا کی جمع آوری، اس کی چکاچوند آسائشوں اور آرام و راحت کے حصول کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جبکہ دوسرا گروہ ان سب چیزوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے جن کا پہلا گروہ عاشق اور فریفتہ تھا۔ ان کی کوششیں اور جدو جہد ایک یکسر مختلف انداز میں ہوتی ہیں، یہ ایک دوسری چیز سے عشق کرتے ہیں۔ یہ معرفت خدا اور اسکی ذات کے عاشق ہوتے ہیں، یہ تخلیق کے اہداف اور فریضہ کی انجام دہی کے درپے رہتے ہیں۔

پہلے گروہ کی ترجیحات کا دوسرے گروہ کی ترجیحات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ ان کا ایک دوسرے سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی طرح دوسرے گروہ کے اہداف بھی پہلے گروہ کے اہداف سے یکسر مختلف ہوتے ہیں، ان کے درمیان باہمی کوئی ربط نہیں ہوتا۔ دنیا صرف دنیا پرستوں اور جہاں خواروں کیلئے چھوڑ دی جاتی ہے۔ ہمارے اس مختصر سے تجزیے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اگر پہلا گروہ طاقت و ظلم کے ذریعے دوسروں کے حقوق چھین کر خود استفادہ کرنے لگے تو ضروری ہے کہ ان کے مقابلے میں دوسرے گروہ کو خاموشی اختیار کرنی چاہئے بلکہ پہلا مقصد یہ ہے کہ کسی بھی حالت میں ہرگز دنیا داروں کے اہداف کی پیروی نہیں کرنی چاہئے۔ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام علم و معرفت کے متلاشیوں اور راہ نجات و سعادت کے طلبگاروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿كَمَا تَرَكُوا لَكُمُ الْحِكْمَةَ فَاتْرُكُوا لَهُمُ الدُّنْيَا﴾ (تحف العقول، ص:۳۸۹)

''جیسا کہ (دنیا پرست اور مادی لوگوں) نے حکمت و دانش کو تمہارے لئے چھوڑ دیا ہے، تم بھی دنیا کو ان کے لئے اسی طرح چھوڑ دو''۔

حجت

خداوند کریم کی طرف سے ثواب و عقاب کی اساس و بنیاد کیلئے ایک میزان اور حساب مقرر ہے۔ اگر آپ کہیں پڑھتے یا سنتے ہیں کہ فلاں کام کیلئے خداوند کریم بے حساب ثواب دیں گے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اصل (حقیقت) میں ثواب بہت زیادہ ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ثواب کی مقدار بہت زیادہ ہے اور اس کے ضمن میں ہم کہیں گے کہ: لطف و کرم کی اساس پہ اس کا حساب ہوا ہے۔ جب تک عدل الٰہی برقرار اور جاری نہیں ہو جاتا اور اسی طرح اگر خداوند کریم عذاب و عقاب نازل کرتے ہیں اور بروز محشر سزا دیتے ہیں تو وہ بھی بغیر دلیل کے نہیں ہے چونکہ یہ انسان جب تک دنیا میں ہے اور اس کے پاس

کوئی عذر اور بہانہ بھی نہیں ہے تو خداوند کریم اس کے خلاف شرع کاموں پہ ضروری توضیح بھی کر دیتے ہیں اور راہنمائی بھی کرتے رہتے ہیں، البتہ خداوند کریم اپنی راہنمائی پیغمبروں کو بھیج کر کرتے ہیں اور یہ راہنما آ کر انسان کو یاد دہانی کرا دیتے ہیں یا پھر عقلی ارشادات کی صورت میں ہوتی ہے جو انسان کو خداوند کریم نے مرحمت فرما رکھی ہے:

﴿اِنَّ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حُجَّتَيْنِ حُجَّةٌ ظَاهِرَةٌ وَ حُجَّةٌ بَاطِنَةٌ فَاَمَّا الظَّاهِرَةُ فَالرُّسُلُ وَالْاَنْبِيَاءُ وَالْاَئِمَّةُ وَ اَمَّا الْبَاطِنَةُ فَالْعُقُوْلُ۔﴾ (اصول کافی، ج:۱، ص:۱۶)

''خدا کی طرف سے لوگوں پر دو حجتیں ہیں: حجت ظاہری اور دوسری حجت باطنی۔ حجت ظاہری انبیاءؑ، رسولوںؑ اور آئمہ علیہم السلام کا مبعوث ہونا ہے جبکہ حجت باطنی عقل ہے''۔

لوگوں کی باتیں

بعض لوگ دانستہ یا نادانستہ طور پر جو کچھ ان کی زبان پہ آتا ہے کہہ دیتے ہیں۔ بعض اوقات جب کسی سے کوئی بات سنتے ہیں تو بغیر تحقیق کئے آگے کہہ دیتے ہیں اور کبھی ایسی باتیں بھی کر جاتے ہیں جو حدس (اندازہ گیری) پہ مبنی ہوتی ہیں جو ایک دو افراد سے ہوتی ہوئی ایک سنجیدہ صورت اختیار کر لیتی ہیں اور مشہور ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات تو یہ صرف سننے والے کا ذاتی استنباط و اجتہاد ہوتا ہے جو باقاعدہ خبر کی صورت اختیار کر کے شہرت پکڑ جاتا ہے۔ اس طرح کی صورت حال میں کہنے اور سننے والے دونوں پہ دو قسم کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ سننے والے پہ یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ جب تک یقین حاصل نہیں ہو جائے وہ بات نہ کہے اور سننے والے کی ذمہ داری یہ ہے کہ ایسی باتیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور صرف مشہور ہو جاتی ہیں کو بالکل اہمیت نہ دے اور ان پر کان نہ دھرے اور ان سے خوفزدہ بھی نہ ہوں۔ اگر چہ بعض اوقات اپنا دفاع کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے اور بے بنیاد اور من گھڑت باتوں کی وضاحت لوگوں کو سمجھانی پڑ جاتی ہیں۔

﴿لَوْ كَانَ فِيْ يَدِكَ جَوْزَةٌ وَ قَالَ النَّاسُ فِيْ يَدِكَ لُؤْلُؤَةٌ مَا كَانَ يَنْفَعُكَ وَ اَنْتَ تَعْلَمُ اَنَّهَا جَوْزَةٌ وَ لَوْ كَانَ فِيْ يَدِكَ لُؤْلُؤَةٌ قَالَ النَّاسُ اَنَّهَا جَوْزَةٌ مَا ضَرَّكَ وَ اَنْتَ تَعْلَمُ اَنَّهَا لُؤْلُؤَةٌ۔﴾ (تحف العقول، ص:۳۸۶)

''اگر تیرے ہاتھ میں اخروٹ ہو اور لوگ کہیں کہ تمہارے ہاتھ میں ہیرے کا دانہ ہے تو تجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا چونکہ تم جانتے ہو کہ تمہارے ہاتھ میں اخروٹ کا دانہ ہے اور اگر تیرے ہاتھ میں ہیرے کا دانہ ہے اور لوگ کہیں کہ تیرے ہاتھ میں اخروٹ ہے تو ان کے کہنے سے تجھے کوئی نقصان نہیں ہوگا چونکہ تم جانتے ہو کہ کیا ہے''۔

عزت کی حفاظت

بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کی عزت و آبرو اور حیثیت سے کھیلتے ہیں، وہ بھی اس طرح کہ خود ہی ایک بات گھڑتے ہیں پھر اس کے ذریعے دوسروں کی عزت و ناموس سے کھیلتے ہیں۔ مگر ایک عقلمند اور مؤمن شخص یہ کام ہرگز نہیں کرتا جس طرح وہ اپنے لئے احترام کو پسند کرتا ہے تاکہ معاشرے میں احترام اور عزت سے زندگی بسر کر سکے۔ دوسروں کیلئے بھی اسی عزت و احترام اور شرافت کا قائل ہوتا ہے اور بغیر دلیل کے کسی کی غیبت تک نہیں کرتا۔ چونکہ خداوند کریم اپنے لوگوں پہ خصوصی لطف و کرم رکھتا ہے تبھی تو ایک عاقل و مؤمن شخص کے اس کام کو بغیر اجر کے نہیں چھوڑتا۔ وہ اس گناہ سے آلودہ نہ ہونے کی جزا اور معصیت سے بچنے کا اجر اسے اپنی طرف سے گناہوں کی بخشش کی صورت میں عطا کرتا ہے۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿مَنْ كَفَّ نَفْسَهُ عَنْ اَعْرَاضِ النَّاسِ اَقَالَهُ اللّٰهُ عَثْرَتَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۱)

''جو بندہ خود کو لوگوں کی عزت سے کھیلنے سے باز رکھتا ہے خداوند کریم قیامت کے دن اس کی خطاؤں کو معاف کر دے گا''۔[1]

ا؎ اسی قسم کا مفہوم قرآن مجید میں سورۂ نور آیت نمبر: ۲۲ اور سورۂ الاعراف آیت نمبر: ۱۹۹ میں بھی ہے۔ (مترجم)

حیاء اور بدزبانی

حیاء ایک ایسی صفت ہے جو راسخ اور قائم رہنے والی ہے اور انسان کو بُرے کاموں کے ارتکاب سے روکتی ہے تا کہ انسان ڈانٹ ڈپٹ سے محفوظ رہ سکے۔ انسان جب صاحب ایمان ہو جاتا ہے تو یہ صفت اس کے اندر خود بخود پیدا ہو جاتی ہے چونکہ خدا پہ ایمان تمام اچھائیوں اور نیکیوں کا سرچشمہ ہوتا ہے جس کے اندر بھی پایا جائے وہ شخص تمام صفات کمال کو پانے والا شمار کیا جائے گا۔ بذأ کا معنی ہے بدزبانی، بایں معنی کہ جو کچھ انسان کی زبان پہ آئے کہہ دے، حالات اور موقع محل کی نزاکت کا خیال نہ کئے بغیر ایک تو وہ مؤدب نہیں کہلوائے گا، دوسرا ایسے شخص کا اختتام جھوٹ، غیبت، تہمت، افتراء، گالیاں، بدزبانی اور دوسروں کو تکلیف دینے پہ جا کر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے آپ بذأ کا معنی (دوسروں پہ ظلم کرنا) بھی لے سکتے ہیں۔ چونکہ مذکورہ صفت کے آجانے کے بعد وہ دوسروں پہ ظلم شروع کر دیتا ہے اور دوسروں کے حقوق کا خیال نہیں کرتا مگر ایک مؤمن شخص بدزبانی سے دُور ہوتا ہے ہمیشہ اپنی زبان کی عفت وعصمت کو محفوظ رکھتا ہے۔

﴿اَلْحَيَاءُ مِنَ الْاِيْمَانِ وَالْاِيْمَانُ فِيْ الْجَنَّةِ وَالْبَذَاءُ مِنَ الْجَفَاءِ وَالْجَفَاءُ فِيْ النَّارِ۔﴾ (تحف العقول، ص: ۳۹۴)

''حیاء ایمان میں سے ہے اور ایماندار شخص جنتی ہے، بدزبانی ظلم میں سے ہے اور ظالم شخص جہنمی ہے''۔

خاموشی

اہل بیتؑ رسولؐ سے منقول روایات اور احادیث میں خاموشی کی بڑی توصیف وتعریف کی گئی ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ خاموشی سے کیا مُراد ہے؟ خاموشی سے مُراد یہ قطعاً نہیں ہے کہ انسان حق بات بھی نہ کہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کرے اور ہدایت و رُشد کا سلسلہ روک دے اور لوگوں سے سلسلہ گفتگو ختم کر کے ہدایت و رہنمائی کا راستہ بند کر دے یا پھر اس پہ کوئی حادثہ اثر انداز نہ ہو اور اس کے متعلق کسی قسم کی گفتگو نہ کرے بلکہ خاموشی سے مُراد یہ ہے کہ انسان بیہودہ، فضول اور بے موقع محل گفتگو، جھوٹے دعوؤں اور جن باتوں پہ عمل نہیں کرتا سے اجتناب کرے، بے ربط اور بے معنی گفتگو واہیات وفحاشی اور گالم گلوچ پہ مبنی گفتگو اور ایسی گفتگو جس کا اوّل و آخر معلوم نہ ہو۔ الغرض جس کا کہنے والا تک مشخص نہ ہو یا ایسی طویل گفتگو جو سننے والے یا سننے والوں کو تھکا دے جس کے نتیجے میں وہ اس سے کوئی فائدہ نہ حاصل کر پائیں سے اجتناب کرے اس ترتیب سے کہ **مؤمن کا عمل اس کی گفتگو سے زیادہ اور منافق کا عمل اس کی گفتگو سے کم ہوتا ہے۔**

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ: اِذَا رَأَيْتُمُ الْمُؤْمِنَ صَمُوْتًا فَادْنُوْا مِنْهُ فَاِنَّهُ يُلْقِي الْحِكْمَةَ وَالْمُؤْمِنُ قَلِيْلُ الْكَلَامِ كَثِيْرُ الْعَمَلِ وَالْمُنَافِقُ كَثِيْرُ الْكَلَامِ قَلِيْلُ الْعَمَلِ۔﴾ (تحف العقول، ص: ۳۹۷)

''رسول اکرمؐ نے فرمایا: جب بھی ایک مؤمن کو خاموش دیکھو تو اس کے قریب ہو جاؤ چونکہ (وہ جب بھی گفتگو کیلئے اپنے لب کھولے گا) وہ تمہیں حکمت ودانش ہی سکھائے گا چونکہ **مؤمن کی باتیں کم اور عمل زیادہ ہوتا ہے اور منافق کی باتیں زیادہ اور عمل کم ہوتا ہے**''۔

عقلمند کیا کرتے ہیں

خداوند کریم نے عقلاء کو عقل جیسی نعمت عطا کر رکھی ہے اس کے سبب ان کا کردار ہمیشہ نظم وضبط کی بنیاد پر قرار پاتا ہے۔ آپ ہمیشہ عقلاء اور دوسرے افراد کے کاموں کے درمیان بڑا واضح فرق محسوس کرتے ہوں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ عقلاء کسی بھی کام کی ابتداء کو مدنظر رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کی انتہاء پہ بھی نظر رکھے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی بھی ان کی موجودہ حالت پہ سودے بازی نہیں کرتے ہیں اور نہ ہی ان کی موجودہ حالت کبھی انہیں دھوکہ دے سکتی ہے۔ تبھی تو ان کا انجام ہمیشہ کامیابی اور کامرانی کی صورت میں قرار پاتا ہے۔ چونکہ عقلاء دُنیا کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں:

﴿اِنَّ الْعُقَلَاءَ زَهِدُوْا فِي الدُّنْيَا وَرَغِبُوْا فِي الْاٰخِرَةِ لِاَنَّهُمْ عَلِمُوْا اَنَّ الدُّنْيَا طَالِبَةٌ وَمَطْلُوْبَةٌ وَالْاٰخِرَةُ طَالِبَةٌ وَمَطْلُوْبَةٌ فَمَنْ طَلَبَ

الْآخِرَةَ طَلَبَتْهُ الدُّنْيَا حَتّٰى يَسْتَوْفِيَ مِنْهَا رِزْقَهُ وَ مَنْ طَلَبَ الدُّنْيَا طَلَبَتْهُ الْآخِرَةُ فَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ فَيُفْسِدُ عَلَيْهِ دُنْيَاهُ وَ آخِرَتَهُ۔﴾ (اصول کافی، ج:۱، ص:۱۸)

''عقلاء دنیا میں موجود (شہوات اور مادیات) میں کسی قسم کی رغبت نہیں رکھتے ہیں، یہ ہمیشہ آخرت کی طرف مائل رہتے ہیں چونکہ یہ بخوبی جانتے ہیں کہ دنیا اور آخرت طالب اور مطلوب ہیں، جو بندہ آخرت کو چاہے گا دنیا اسے تلاش کرے گی تا کہ وہ دنیا سے اپنے حصے سے استفادہ کر سکے اور جو بندہ دنیا کا طلبگار ہے آخرت اسے طلب کرے گی مگر وہ آخرت کیلئے کوئی کام انجام نہیں دے پائے گا حتیٰ کہ پھر اس کو موت آ لے گی، یوں اس کی دنیا و آخرت دونوں تباہ ہو جائیں گی''۔

عقلاء کی نیند

یہاں ہماری گفتگو میں جاہل سے مراد ایسا شخص ہے جو اپنی عقل وفکر کی روشنی میں مذہبی اعمال اور عبادات کو انجام نہیں دیتا۔ اگر ایسا فرد زحمت کرتے ہوئے عبادات بھی انجام دے اور عبادات کے رنج والم کو بھی برداشت کرے پھر بھی اس کو عبادات کا ثواب کم ملے گا۔ مگر چونکہ ایک عقل مند انسان علم و آگاہی اور معرفت کامل سے عبادات کو انجام دیتا ہے تو خداوند کریم کی بارگاہ میں اسے خصوصی قرب حاصل ہو جاتا ہے اور یوں وہ اپنی عبادات کا اجر وثواب بھی زیادہ مقدار میں پاتا ہے۔ کبھی کبھارتو موضوع عبادت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا یعنی بعض اوقات ایک عاقل شخص ایسا کام انجام دیتا ہے جو بالکل غیر عبادی ہوتا ہے مگر اس کے باوجود اس کا اجر جاہل کی عبادت کے اجر سے زیادہ ہوتا ہے مثلاً ایک عقل مند شخص بظاہر استراحت کرتا ہے مگر اس کی استراحت جاہل کی نماز شب اور شب بیداری سے افضل ہوتی ہے۔ ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ کس طرح سونا شب بیداری اور عبادت سے افضل ٹھہرا؟ ہم اس کے جواب میں صرف اتنا عرض کریں گے کہ اولاً سونا ایسے جاگنے سے بہر حال بہتر ہے جس سے صحیح اور مکمل فائدہ حاصل نہ کیا جائے۔ ثانیاً اگر سونا اس نیت سے ہو کہ سونے سے میرے اعصاب کو تقویت ملے گی اور میں نئے سرے سے عبادات کیلئے خود کو بہتر طور پر آمادہ کرسکوں گا تو یہ سونا بھی عبادات میں شمار ہوگا، اس کی قدر و قیمت اور جزاء بھی ہے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ایک چھوٹے سے مگر پرمغز اور پر معنی جملے میں اس حقیقت کو بیان فرماتے ہیں:

﴿نَوْمُ الْعَاقِلِ أَفْضَلُ مِنْ سَهَرِ الْجَاهِلِ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۷)

''عقل مند کا سونا جاہل کی شب بیداری سے افضل ہے''۔

خود کو برتر سمجھنا

ہم لفظ تکبر بارہا سن چکے ہیں اور اس کے معانی سے بھی بخوبی آشنائی رکھتے ہیں۔ لفظ تعظم کے اندر بھی وہی تکبر والا معنی پایا جاتا ہے اگر ہم لفظ تکبر اور تعظم کے معانی پہ غور کریں تو دونوں کے معانی ''اپنے آپ کو بڑا سمجھنا'' اور ''دوسروں سے اعلیٰ و برتر سمجھنا'' کے ہیں جبکہ اصلی اور حقیقی بڑائی و عظمت صرف ذاتِ خدا کیلئے ہے اور تمام افراد خداوند کریم کے مقابلے میں چھوٹے اور حقیر ہیں۔ لفظ اللہ اکبر کا معنی (خدا بزرگ و برتر ہے) اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی بزرگ ہے اور خدا اس سے بڑا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ خداوند کریم اس سے بہت بالا و اعلیٰ ہے کہ اس کی صفت و ثناء بیان کی جا سکے اور اس کے فوائد و شان وشوکت بیان کی جا سکے۔

اپنے آپ کو برتر سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان دوسروں کی نسبت خود کو بڑا اور بہتر سمجھنے لگے اور اپنی رائے کو دوسروں کی آراء پر فوقیت دینے لگے اور دوسروں کو اپنی نسبت حقیر سمجھنے لگے اور ہمیشہ خود کو ''تافتہ جدا بافتہ ای'' (یعنی ہم جیسا کوئی نہیں ہے) سمجھنے لگے تو ایسا شخص بالآخر شکست سے دوچار ہوتا ہے اور ملائکہ کی لعنت کا مستحق ٹھہرتا ہے:

﴿مَنْ تَعَظَّمَ فِيْ نَفْسِهِ لَعَنَتْهُ مَلَائِكَةُ السَّمَاءِ وَ مَلَائِكَةُ الْأَرْضِ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۷)

''جو بندہ اپنے آپ کو برتر اور بزرگ سمجھنے لگے زمین و آسمان کے فرشتے اس پہ لعنت کرتے ہیں''۔

خودگمانی

علم اخلاق میں خوش بینی (حُسن ظن) کی جہاں تعریف کی گئی ہے وہیں بد بینی (بدظن) کی مذمت کی گئی ہے یعنی ضروری ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے متعلق خوش بین حُسن ظن رکھیں اور آپس میں سوءظن اور بدگمانی سے اجتناب کریں البتہ یہ سب کچھ تبھی ممکن ہے جب معاشرے میں ایک پاک و پاکیزہ اور شفاف فضا میں قائم اور رائج ہو۔ اگر خدانخواستہ معاشرے میں پوری کی پوری فضا آلودہ اور ناپاک ہو اور اس کا رواج بھی ظلم و باطل پہ مبنی ہو تو پھر یہ قاعدہ اُلٹ جاتا ہے۔ اس وقت صرف ایک اخلاقی حکم اور قانون کو ہم معیار نہیں بنا سکتے بلکہ تحقیق و تفتیش کی ضرورت پڑے گی کہ اصل صورتحال سے آگاہی حاصل کی جائے۔ ہماری اس گذارش کا خلاصہ یہ ہے کہ سب سے پہلے افراد کی حالت کو مدنظر رکھا جائے پھر ان کے متعلق کوئی فیصلہ کیا جائے۔

﴿إِذَا كَانَ الْجَوْرُ أَغْلَبُ مِنَ الْحَقِّ لَمْ يَحِلَّ لِأَحِدٍ أَنْ يَظُنَّ بِأَحَدٍ خَيْرًا حَتّٰى يَعْرِفَ ذَالِكَ مِنْهُ﴾ (تحف العقول، ص:۴۰۹)

''جب ظلم حق سے زیادہ ہو جائے تو پھر کسی شخص کے متعلق حُسن ظن رکھنا جائز نہیں ہوگا، ہاں اگر اس کے نیک ہونے کا یقین ہو تو پھر صحیح ہے''۔

نیک نیت

نیک نیت شخص وہ ہے جو اچھی اور صاف ستھری زندگی بسر کرنا چاہتا ہے اور وہ اس دنیا میں رہ کر اپنی آخرت کی تیاری کرتا ہے اور اسی چیز کی وہ دوسروں سے بھی اُمید رکھتا ہے۔ اگر وہ خود کوئی ایسی چیز رکھتا ہو جو دوسروں کے ہاں موجود نہ ہو تو اس چیز کے حصول کیلئے وہ ان کی مدد کرتا ہے، اگر اس کے پاس مال و دولت نہ ہو تو یہ خواہش اور آرزو ضرور رکھتا ہے کہ جب مجھے مال و دولت ملے گی تو ان کی مدد ضرور کروں گا اور اگر کبھی اس کی یہ آرزو یا خواہش پوری ہو جائے تو وہ فوراً اپنی اس تمنا کو عملی شکل دینے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک نیک نیت شخص کو ہم اس کے اعمال، کردار، اس کے دل سے نکلنے والے الفاظ جو صمیم قلب سے اس کی زبان پہ جاری ہوتے ہیں سے پہچان سکتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک نیک نیت شخص مکمل سادگی کے ساتھ بڑی مطمئن اور خوشحال زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے، اس کی زندگی ان آرزوؤں اور چالاکیوں سے یکسر خالی ہوتی ہے جس کے ذریعے انسان بہت ساری دولت اکٹھی کرتا ہے۔ یہ صرف اور صرف خیر خواہی اور حسن نیت کا ایک طبعی اثر ہے، جیسا کہ ایک فارسی کی مثل مشہور ہے کہ **''ہر کس نان نیت خود رامی خورد''**(ہر بندہ اپنی نیت کی روٹی کھاتا ہے)۔

اس بارے میں امام کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿مَنْ حَسُنَتْ نِيَّتُهُ زِيْدَ فِيْ رِزْقِهٖ﴾ (تحف العقول، ص:۳۸۸)

''جس کی نیت صاف ہوگی اس کی روزی میں اضافہ کر دیا جاتا ہے''۔

ضبطِ نفس

بے جا غصہ بہت بُری چیز ہے۔ اور یہ غصہ کرنے والے کی کمزوری پہ دلالت کرتا ہے، اس کی کمزوری اور بے مائیگی کا مظہر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ضبط انسان کی قوتِ قلبی، طاقت، خاندانی پن اور نفس کے قوی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ جبکہ جلد غصے میں آجانے والا شخص جسے اصطلاح میں **''زود از کورہ بدر می رود''** (جو دُودھ کی ابالی کھا جاتا ہے)۔ کہتے ہیں حالت اختیاری میں یا بے اختیاری میں اس کے منہ میں جو آئے کہہ دیتا ہے اور جو کام اس کے سامنے آئے اُسے کر گزرتا ہے مگر ایک عقلمند اور قوی النفس آدمی عین غصہ کے عالم میں بھی اپنے اعصاب پہ مکمل کنٹرول رکھتا ہے وہ اپنے نفس کو آزاد نہیں چھوڑ دیتا اور سوچ و بچار کرتا ہے اور عزم بالجزم کے ساتھ مصلحت دیکھ کر کام کو انجام دیتا ہے اور جب غصے کے آثار تھم جاتے ہیں وہ اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ میں نے کتنا عظیم کام انجام دیا ہے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

﴿مَنْ كَفَّ غَضَبَهُ عَنِ النَّاسِ كَفَّ اللّٰهُ عَنْهُ غَضَبَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۱)

''جو اپنے غصے سے لوگوں کو امان میں رکھتا ہے خداوند کریم بروز قیامت اسے اپنے غصے سے محفوظ رکھے گا''۔

واجب الحصول علوم

بہت سی چیزیں ہیں جن کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے اورانسان انہیں جاننے کا مشتاق بھی ہے مگران سب کوصفحۂ ذہن میں محفوظ کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا البتہ بہت ساری معلومات ایسی بھی ہیں جنہیں مختلف پہلوؤں سے یاد کرنا لازمی ہو جاتا ہے، البتہ دین کے راہنماؤں (آئمہ علیہم السلام) کو مدنظر رکھتے ہوئے مذہب کے بارے میں بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کا یاد کرنا انسان کیلئے لازمی اور ضروری ہوتا ہے تا کہ وہ دین و آخرت کی ابدی سعادت حاصل کر سکے۔ چونکہ ان عظیم ہستیوں نے ان مسائل کو یاد کرنے کی خصوصی تاکید فرمائی ہے اور اپنے پیروکاروں اور ماننے والوں سے بھی تقاضا کیا ہے کہ وہ ان علوم کو حاصل کریں۔

﴿وَجَدْتُ عِلْمَ النَّاسِ فِیْ أَرْبَعٍ أَوَّلُهَا أَنْ تَعْرِفَ رَبَّكَ وَالثَّانِيَةُ أَنْ تَعْرِفَ مَاصَنَعَ بِكَ وَالثَّالِثَةُ أَنْ تَعْرِفَ مَا اَرَادَ مِنْكَ وَالرَّابِعَةُ أَنْ تَعْرِفَ مَا يُخْرِجُكَ مِنْ دِيْنِكَ۔﴾ (بحارالانوار، ج:۷۵،ص:۳۲۸)

''میرے نزدیک چار چیزوں کا علم لوگوں کیلئے ضروری ہے: پہلا اپنے پروردگار کی معرفت، دوسرا وہ نعمات جو خدا نے تجھے عطا کی ہیں ان کی طرف متوجہ ہونا، تیسری وہ چیز جن کا پروردگار نے تجھ سے تقاضا کیا ہے (انہیں پڑھو بھی اوران پر عمل بھی کرو)، چوتھی چیز جو تجھے دین سے دُور کرتی ہے (ان کو پہچانو بھی اوران سے دُوری اختیار کرنا بھی ضروری ہے)''۔

علم اور فکر

علم اوردانائی سعادت ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی جس شخص نے علم و دانش حاصل کر رکھا ہے وہ مختلف مسائل کے متعلق غوروفکر اور مطالب کی حقیقت کو پانے کی صلاحیت رکھتا ہے، چونکہ سوچ بچار اور غوروفکر کیلئے آلات کی ضرورت ہوتی ہے اور علم اس کیلئے بہترین آلہ ہے۔ جی ہاں! عالم اپنے علم کے ذریعے راستے کی تعین کرتا ہے اور منزل مقصود کو پالیتا ہے اور کبھی راہ کو گم نہیں ہونے دیتا اور عالم علم کی فیوض و برکات کے ذریعے حقائق کو درک کرتا ہے البتہ پیغمبر ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان: ''عالم وہ ہے جو خدا کی معرفت رکھتا ہوتا کہ خدا کی اطاعت کر سکے اور خدا کے غیض وغضب کا موجب بننے والی چیزوں سے اجتناب کر سکے'' (مجمع البیان، ج:۸،ص:۲۸۴) کی روشنی میں امام ہفتمؑ نے فرمایا:

﴿ثُمَّ بَيَّنَ أَنَّ الْعَقْلَ مَعَ الْعِلْمِ فَقَالَ (تحف العقول،ص:۳۸۴) وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُوْنَ۔﴾ (سورۂ عنکبوت، آیت:۴۳)

''پھر خداوند کریم نے بیان فرمایا کہ غوروفکر علم کے ساتھ ہے اور فرمایا: ہم ان مثالوں کو لوگوں کیلئے پیش کرتے ہیں صرف اہل علم ہی ان کے متعلق غوروفکر کرتے ہیں''۔

خدا کی راہ میں

بعض مواقع پر انسان کیلئے خدا کے حکم کو بجالانے کی غرض سے اپنا مال خرچ کرنا واجب ہو جاتا ہے اوران مذکورہ مواقع میں بخل و کنجوسی سے کام لینے کا مطلب یہ ہوگا کہ گویا اس نے اپنا فریضہ انجام نہیں دیا ہے، قطع نظر اس کے کہ ہنوز ذمہ داری (وجوب) اس کی گردن پہ باقی ہے۔اس کا اثر اور ردعمل سبب بنتا ہے کہ خدا کی راہ سے ہٹ کر اس کی نافرمانی کرتے ہوئے اسے دو برابر مال خرچ کرنا پڑ جائے جس کے نتیجے میں اس کا دامن گناہوں سے آلودہ ہو جائے۔

بنابرایں ایک عقلمند انسان خداوند کریم کی اطاعت کی راہ میں ہمیشہ حاضر اور تیار نظر آتا ہے۔وہ جانی اور مالی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں سُستی سے کام نہیں لیتا۔

ہمارے ساتویں امامؑ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿إِيَّاكَ أَنْ تَمْنَعَ فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ فَتُنْفِقَ مِثْلَيْهِ فِيْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ۔﴾ (تحف العقول،ص:۴۰۸)

''خدا کی اطاعت کی راہ میں مال خرچ کرنے میں سُستی نہ کرو ورنہ اس کے دو برابر مال خدا کی نافرمانی پہ خرچ ہو جائے گا''۔

گہرا سمندر

ہمارے آئمہ اطہار علیہم السلام نے لوگوں کی رشد و ہدایت کیلئے اپنے فرامین میں سابقہ انبیاء علیہم السلام، حکماء اور آئمہ علیہم السلام کے حکمت آمیز کلمات اور دانش بھری مثالوں سے استفادہ کیا ہے اور انہیں لوگوں کے اندر بیداری پیدا کرنے اور شعور کو اُجاگر کرنے کیلئے پیش کیا ہے۔اس مقام پر ہمارے ساتویں امام علیہ السلام حضرت لقمان علیہ السلام کی نصیحتیں اور مثالیں پیش کر رہے ہیں جو آپ علیہ السلام نے ایک فاضل اور فہم و فراست کے مالک شخص ''ہشام'' کیلئے بیان فرمائی ہیں:

﴿إِنَّ لُقْمَانَ قَالَ لِابْنِهِ تَوَاضَعْ لِلْحَقِّ تَكُنْ أَعْقَلَ النَّاسِ يَا بُنَيَّ إِنَّ الدُّنْيَا بَحْرٌ عَمِيقٌ قَدْ غَرِقَ عَالَمٌ كَثِيرٌ فَلْتَكُنْ سَفِينَتُكَ فِيهَا تَقْوَى اللّٰهِ وَجِسْرُهَا الْإِيمَانَ وَ شِرَاعُهَا التَّوَكُّلَ وَ قَيِّمُهَا الْعَقْلَ وَ دَلِيلُهَا الْعِلْمَ وَ سُكَّانُهَا الصَّبْرَ﴾ (تحف العقول، ص:٣٨٦)

''حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے فرمایا: حق کے سامنے تواضع اور انکساری بجا لاؤ (اور اسے قبول کرو) تاکہ لوگوں میں عاقل ترین انسان بن سکو، اے میرے فرزند! دنیا ایک گہرا سمندر ہے جس میں بہت زیادہ لوگ غرق ہو چکے ہیں پس دنیا میں تیری کشتی تقویٰ اور پرہیز گاری ہونی چاہئے، ایمان کا پُل اور توکل بادبان ہونا چاہئے اس کے چپو عقل اور سمت نما علم ہونا چاہئے، اس کے مسافر اہل صبر ہونے چاہئے''۔

امداد باہمی

فقہ اسلامی، احادیث اور روایات میں لفظ ''صدقہ'' بہت زیادہ استعمال ہوا ہے۔اس سے مراد کہیں صدقہ واجب یعنی زکوٰۃ ہے اور بعض اوقات صدقہ مستحبی ہے جیسے تحفہ اور تبرک کی نیت سے کسی کی مالی مدد کرنا وغیرہ ہے۔اگر کوئی بندہ کسی ایسے شخص کی جو مالی لحاظ سے ناتواں ہو اور اس کے اخراجات اس کی آمدن سے زیادہ ہوں مالی مدد کرتا ہے جس کے ذریعے وہ اس مالی بھونچال سے نجات حاصل کر لیتا ہے تو یہ صدقہ ہے۔اور اگر وہ امیر شخص اس سے زیادہ ہمت سے کام لے اور ایک کمزور و ناتواں شخص کی فکری اور ذہنی لحاظ سے مدد کرے اور اسے ظالموں کے ظلم و ستم سے نجات دلائے تو اس نے ایسے شکنجے اور گھمبیر مسئلے سے جو مالی فقر و فاقہ سے بدتر ہے سے اسے گویا نجات دلائی ہے تبھی تو امام موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام نے ایک چھوٹے سے خوبصورت جملہ میں بہت بڑے مسئلے کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

﴿عَوْنُكَ لِلضَّعِيفِ مِنْ أَفْضَلِ الصَّدَقَةِ﴾ (تحف العقول، ص:٤١٤)

''ایک کمزور و ناتواں شخص کی مدد کرنا تیرا بہت بڑا صدقہ ہے''۔

دست نیاز

امام ہفتم (موسیٰ کاظم علیہ السلام) امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے بیان سے ایک اہم مطلب کی طرف اشارہ فرماتے ہیں جو انتہائی توجہ طلب ہے۔ہر شخص کی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایک اتفاق ضرور رونما ہوتا ہے کہ اس حساس موقع پر آپ کی شخصیت اور عزت ناموس عیاں ہو جاتی ہے اور انسان حیران رہ جاتا ہے کہ اب وہ کیا کرے، کیا وہ ہر کسی سے اپنی ضرورتوں کا اظہار کرے اور ہر کسی سے مدد طلب کرنے لگے یا پھر مخصوص افراد سے کمک طلب کرے۔

﴿قَالَ الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ: إِذَا طَلَبْتُمُ الْحَوَائِجَ فَاطْلُبُوهَا مِنْ أَهْلِهَا قِيلَ يَا ابْنَ رَسُولِ اللّٰهِ وَ مَنْ أَهْلُهَا؟ قَالَ: الَّذِينَ قَصَّ اللّٰهُ فِي كِتَابِهِ وَ ذَكَرَهُمْ فَقَالَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ﴾ (سورۂ زمر، آیت:٩) ﴿قَالَ هُمْ أُولُوا الْعُقُولِ﴾ (اصول کافی، ج:١، ص:١٩)

''حضرت حسن علیہ السلام بن علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: اپنی ضروریات کو ان کے اہل سے طلب کرو، عرض کیا گیا وہ کون لوگ ہیں؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں خداوند کریم نے اپنی کتاب میں جن کے نام درج کر دیئے ہیں اور ان کا تذکرہ بھی فرمایا ہے، صرف صاحبان عقل ہی نصیحت پکڑیں گے اور پھر فرمایا: وہ صاحبان عقل ہیں۔

دشمن خدا

انسان کی عمر بہت قیمتی چیز ہوتی ہے کہ اس میں جتنے لحات (بتدریج) گزرتے جاتے ہیں وہ بہت قیمتی ہوتے ہیں۔ پس انسان کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے قیمتی وقت کو فضولیات اور لغویات میں نہ گزارے یا ایسے کاموں میں مشغول رہے جن کا مادی اور معنوی لحاظ سے کوئی نتیجہ ہی نہ ہو۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ انسان اگر لغویات میں اپنی زندگی بسر کرے تو یہ سبب محق ہے کہ انسان کی تلف شدہ قیمتی عمر کا اعادہ ممکن نہیں ہے، مسئلہ یہ ہے کہ ایسی حرکات وسکنات خداوند کریم کے نزدیک بھی پسندیدگی کی سند حاصل نہیں کر پاتی ہیں۔

اللہ کی ذات ہرگز نہیں چاہتی کہ انسان ایسی حالت کو متحمل ہو۔ بنابرایں ایک انسان کیلئے ضروری ہے کہ وہ جو کام بھی انجام دے ضروری ہے کہ اس کے سبب اور موجب کو بھی جانتا ہو تا کہ اس کا کوئی کام عبث اور فضول قرار نہ پائے ورنہ اس کام سے نہ فقط وہ استفادہ نہیں کر پائے گا بلکہ خدا کی دشمنی اور غضب کو بھی دعوت دے بیٹھے گا۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يُبْغِضُ الضَّحَاكَ مِنْ غَيْرِ عَجَبٍ وَالْمَشَّاۤ إِلٰى غَيْرِ أَرَبٍ۔﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۴)

''خداوند کریم جو شخص بغیر سبب کے زیادہ ہنسے اور جو بغیر مقصد کے اِدھر اُدھر گھومتا رہتا (اصلاح خاص آوارہ گردی کرتا) ہے سے دشمنی رکھتا ہے''۔

تبدیلیاں

انسان کیلئے ضروری ہے کہ اپنی نجات کیلئے اپنے رب کی معرفت حاصل کرے اور اپنے اعمال صالح پہ اعتماد کرے اور خدا کی جزاء پہ یقین رکھتا ہو اور وہ جانتا ہو کہ اس کے نیک اعمال کا ثواب اور جزاء ضروری اور حتمی ہے۔ اس جہاں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور انقلابات سے عبرت حاصل کرے، صرف موجودہ حالت پہ بھروسہ کافی نہیں ہوتا ہے۔ چونکہ زمانے کے حالات میں کبھی یکسانیت نہیں ہوتی ہے اس جہاں میں مال و دولت، مقام، جاہ وحشم کو ثبات و دوام نہیں ہے ان کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔

﴿يَا هُشَامُ خُذْ مَوْعِظَتَكَ مِنَ الدَّهْرِ وَأَهْلِهِ فَإِنَّ الدَّهْرَ طَوِيْلَةٌ قَصِيْرَةٌ فَاعْمَلْ كَأَنَّكَ تَرَىٰ ثَوَابَ عَمَلِكَ لِتَكُوْنَ أَطْمَعَ فِيْ ذٰلِكَ وَاعْقِلْ عَنِ اللّٰهِ وَانْظُرْ فِيْ تَصَرُّفِ الدَّهْرِ وَأَحْوَالِهِ فَإِنَّ مَاهُوَ آتٍ مِنَ الدُّنْيَا كَمَا وَلّٰى مِنْهَا فَاعْتَبِرْ بِهَا۔﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۱)

''حضرت امام موسیٰ کاظم ؑ نے ہشام کو فرمایا کہ: اس زمانے اور زمانے والوں سے اپنے لئے سبق سیکھو! چونکہ زمانے کی گردشیں طویل ہوتی ہیں لیکن مخلوق کیلئے بہت تھوڑی ہیں، اس طرح عمل کرو کہ گویا تم اس کے جزاء اور ثواب کو دیکھ رہے ہو تا کہ مذہبی امور اور دینی اعمال میں تیری اُمید اور لالچ قوی تر ہو، خدا کو پہچانو (عقل کی روشنی میں قرآن وسنت کی رو سے خدا سے علم حاصل کرو) زمانے کی اچھی تبدیلیوں اور گردشوں میں غور وفکر کرو چونکہ دنیا کا مستقبل اس کی ماضی کی مثل ہوتا ہے لہٰذا اس لحاظ سے سبق سیکھو!''۔

دل تنگی اور سُستی

کبھی انسان افسردہ ہو جاتا ہے یا تھک جاتا ہے، ان دو حالتوں کے عوامل نفسیاتی یا جسمانی بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ دونوں حالتیں وقتی اور جلد ختم ہونے والی ہوں تو پھر کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ انسان اپنے روزمرہ کے معمولات اپنی ذمہ داریاں اور عبادات کو انجام دینے لگتا ہے اور اگر یہ دونوں حالتیں طول پکڑ جائیں تو پھر ان کو ختم کرنے کیلئے انسان کو عملی اقدامات اور علاج معالجہ کرانا ہوگا اور کوشش کرکے ان دونوں حالتوں کو اپنے اندر سے ختم کردے تا کہ انسان اپنی معمولات کی عبادات اور روزمرہ کی زندگی کی طرف لوٹ سکے۔ چونکہ افسردگی اور تھکاوٹ انسان کو زندگی کی جدوجہد اور کام کاج سے روک دیتی ہے جس کے نتیجے میں انسانی زندگی کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، بالخصوص عبادات پہ بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں جس کے سبب انسان آخرت سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

امام موسیٰ کاظم ؑ اپنے فرزند کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:

﴿إِيَّاكَ وَالضَّجَرَ وَالْكَسَلَ فَإِنَّهُمَا يَمْنَعَانِ حَظَّكَ مِنَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔﴾ (تحف العقول، ص:۴۰۹)

''کم ظرفی اور سُستی سے اجتناب کرو چونکہ یہ دونوں صفات تمہیں دنیا و آخرت سے محروم کر دیں گی''۔

باہمی ہمدردی

آئمہ اطہار علیہم السلام نے خدا کے عطا کردہ علم و دانش سے جب بھی مقام نصیحت پہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا چاہی تو صرف قرآن اور اپنی دلنشین گفتگو پہ اکتفاء نہیں کیا، بعض اوقات تو مصلحت کو دیکھتے ہوئے دوسری آسمانی کتب کے اقتباسات منتخب کر کے لوگوں کے سامنے بیان فرمائے۔

اس مقام پر بھی امام کاظم علیہ السلام ہشام کیلئے انجیل سے درج ذیل اقتباس بیان فرماتے ہیں:

﴿طُوْبٰی لِلْمُتَرَاحِمِیْنَ اُوْلٰئِكَ هُمُ الْمَرْحُوْمُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ طُوْبٰی لِلْمُصْلِحِیْنَ بَیْنَ النَّاسِ اُوْلٰئِكَ هُمُ الْمُقَرَّبُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ طُوْبٰی لِلْمُطَهَّرَةِ قُلُوْبُهُمْ اُوْلٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۳)

''خوش بخت ہیں وہ لوگ جن کے دل ایک دوسرے کیلئے تڑپتے ہیں، یہ لوگ بروز قیامت خداوند کریم کے خصوصی رحم کے مستحق قرار پائیں گے، خوش بخت ہیں وہ لوگ جو دوسروں کی اصلاح کرتے ہیں، یہ لوگ بروز قیامت خدا کے مقربین ٹھہریں گے، خوش بخت ہیں وہ لوگ جن کے دل پاک ہیں، یہی لوگ بروز قیامت متقی و پرہیزگار ہوں گے''۔

دل اور نفسانی خواہشات

کتنے خوش بخت ہیں جناب ہشام جو عقائد، تربیت اور اخلاق سے مربوط گفتگو آسمانی مدارک سے استفادہ کرتے ہوئے امام موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام کی مقدس زبان سے سنتے رہے ہیں۔ اب کی بار حضرت داؤد علیہ السلام کی باری ہے، خداوند کریم نے ان پہ جو وحی نازل فرمائی تھی کو جناب ہشام کیلئے بیان فرما رہے ہیں:

﴿اَوْحَی اللّٰهُ اِلٰی دَاوُدَ:

یَا دَاوُدُ حَذِّرْ فَاَنْذِرْ اَصْحَابَكَ عَنْ حُبِّ الشَّهَوَاتِ فَاِنَّ الْمُعَلَّقَةَ قُلُوْبُهُمْ بِشَهَوَاتِ الدُّنْیَا قُلُوْبُهُمْ مَحْجُوْبَةٌ عَنِّی۔﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۷)

''خداوند نے حضرت داؤد علیہ السلام کو وحی فرمائی:

اے داؤد علیہ السلام اپنے پیروکاروں کو نفسانی شہوات و خواہشات سے محبت کرنے سے ڈراؤ اور انہیں روکو چونکہ جس کا دل دنیا کی خواہشات سے جتنا بھرا ہوا ہو گا اس کا دل اتنا ہی مجھ سے دُور ہٹ جائے گا!''۔

دُنیا پرستی

انسان کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہو گی کہ وہ مال و دولت، زر و زیورات اور دنیا کی لذتوں میں کھو جائے اور صرف دنیا ہی کا ہو کر رہ جائے۔ چونکہ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ آخرت کو فراموش کر دے گا یا آخرت کا خوف اس کے اندر سے ختم ہو جائے گا جو شقاوت ابدی کو دعوت دینے کے مترادف ہو گا اور اگر کوئی اس مصیبت سے دوچار ہو جائے چاہے وہ عالم ہی کیوں نہ ہو۔ چونکہ علم صرف اُس دنیا (آخرت) میں کامیابی حاصل کرنے کی غرض سے تھا جبکہ یہ علم اپنے اندر مذکورہ صفت سے خالی ہے جس کے نتیجے میں یہ صاحب علم کیلئے ہرگز سودمند ثابت نہیں ہو گا۔

﴿مَنْ اَحَبَّ الدُّنْیَا ذَهَبَ خَوْفُ الْاٰخِرَةِ مِنْ قَلْبِهٖ وَ مَا اُوْتِیَ عَبْدٌ عِلْمًا فَازْدَادَ لِلدُّنْیَا حُبًّا اِلَّا ازْدَادَ مِنَ اللّٰهِ بُعْدًا وَازْدَادَ اللّٰهُ عَلَیْهِ غَضَبًا۔﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۹)

''جو بندہ اس دنیا کا متمنی ہو گا (اپنی تمام کوششیں اور جد و جہد دنیا اور مادیات کیلئے وقف کرتا ہے) تو آخرت کا خوف اس کے دل سے نکل جاتا ہے جس بندے کو جتنا علم دیا جاتا ہے اس کے دل میں دنیا کی محبت اس قدر بڑھتی جاتی ہے (جس کے نتیجے میں) وہ خدا سے دُور ہوتا جاتا ہے اور خدا کا غضب اس پر بڑھتا چلا جاتا ہے''۔

دُور اندیشی

اگر انسان اپنی زندگی کیلئے ساز و سامان کی فراہمی اور اپنے اعمال سے صحیح طور پر استفادہ کرنا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں نظم وضبط اور ترتیب کا خصوصی خیال رکھے۔ جو کام بھی انجام دینا چاہتا ہے سب سے پہلے اس کے بارے میں غور وفکر کرے اور اس کے انجام اور نتیجے پہ نظر رکھے۔ صرف اس کی موجودہ کیفیت کو سامنے رکھ کر اسے انجام دینے کا فیصلہ نہ کرے بلکہ مستقبل قریب اور مستقبل بعید کے بارے میں خود بھی اپنی عقل اور فکر سے کام لے اور اس بارے میں دوسروں سے مشورہ بھی کرے اور اگر ایسے کرتا ہے تو گویا اس نے اپنی حد تک اپنا فریضہ شرعی انجام دے دیا ہے جبکہ مطلوبہ نتائج تک رسائی خداوند کریم کی مشیت و ارادے پہ موقوف ہے۔

کہتے ہیں کہ: ﴿اَلْعَبْدُ یُدَبِّرُ وَاللّٰهُ یُقَدِّرُ﴾ (Man proposes God disposes) ''حرکت میں برکت ہے''۔ خدا کا بندہ صرف فکرو تدبیر کرتا ہے جبکہ اس کا مقدر اور اس کی عملی صورت خداوند کریم کے ہاتھ میں ہے۔

حضرت موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام اس بارے میں ایک چھوٹے سے مگر معنی خیز جملے میں ارشاد فرماتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

﴿اَلتَّدْبِیْرُ نِصْفُ الْعَیْشِ﴾ (تحف العقول، ص:۴۰۳)

''فکرو تدبر اور ایڈمنسٹریشن آدھی زندگی ہے''۔

قبولیت دُعا کیلئے ایک اشارہ

دُعا کی قبولیت کیلئے مخصوص شرائط موجود ہیں جو اخبار و احادیث اور دُعاؤں کی کتب میں باقاعدہ ذکر کی گئی ہیں۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ان میں سے صرف ایک کو بیان فرما رہے ہیں کہ: ''دُعا کرتے وقت اپنی حاجت اور اصل معاملہ اللہ کی بارگاہ میں پیش کرنے سے قبل اپنے پروردگار کی حمد و ثناء اور تعریف و تمجید بجالاؤ، پھر پیغمبرؐ گرامی قدر پہ دُرود و سلام بھیجو۔ اب وہ زبان جو حمد خدا اور نبیؐ پہ دُرُود بھیجنے سے متبرک ہو چکی ہے پہ اپنی حاجات کو لاؤ اور انہیں خداوند کریم کی ملکوتی بارگاہ میں پیش کرو۔ اس طرح اُمید کی جا سکتی ہے کہ ذاتِ اقدس کبریائی اس تعظیم و احترام کے صدقے جو خداوند کریم اور نبی اکرمؐ کی ذات کیلئے بجا لایا گیا ہے اور یہ دعا کرنے والے کے اخلاص اور معنوی صفائی کی علامت ہے، خداوند کریم اس پہ رحم فرمائیں گے اور اس کی دُعا کو قبول کریں گے''۔

﴿مَنْ دَعَا قَبْلَ الثَّنَاءِ عَلَی اللّٰهِ وَالصَّلَاةِ عَلَی النَّبِیِّ کَانَ کَمَنْ رَمٰی بِسَهْمٍ بِلَا وَتَرٍ﴾ (تحف العقول، ص:۴۰۳)

''جو بندہ خدا کی حمد و ثنا اور نبیؐ رحمت کی ذات پہ دُرُود و سلام سے قبل دُعا کرے اور کوئی چیز طلب کرے وہ ایسے ہی ہے جیسے بغیر کمان کے کوئی بندہ تیراندازی کرے''۔

آنے والے دن

قرآن کریم میں ''قیامت کے دن'' اور ''انسان کے نامۂ اعمال میں اس کے اعمال کے درج ہونے والے دن'' ''خداوند کریم کی عدالت میں ہر انسان کے فیصلے والے دن'' کے بارے میں خصوصی توضیح اور تشریح ذکر ہوئی ہے۔ ادعیہ ماثورہ جو نبی اکرمؐ اور آئمہ اطہار علیہم السلام سے منقول ہیں جیسے دُعا ابوحمزہ میں قیامت کے دن کے متعلق ارشادات موجود ہیں اور اخبار و احادیث میں بھی قیامت کے دن کے بارے میں کافی ڈرا دینے والی باتوں کا تذکرہ موجود ہے تاکہ لوگوں کی توجہ آخرت کی طرف زیادہ ہو اور خوابِ غفلت سے بیداری میں ان کیلئے مفید اور مؤثر ثابت ہوں، ان میں درج ذیل فرمان بھی شامل ہے جو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے فرامین میں سے ہے:

﴿أَصْلِحْ أَیَّامَكَ الَّذِیْ هُوَ أَمَامَكَ فَانْظُرْ أَیَّ یَوْمٍ هُوَ أَعِدَّلَهُ الْجَوَابَ فَإِنَّكَ مَوْقُوْفٌ وَ مَسْئُوْلٌ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۱)

''اپنے آنے والے دنوں کے بارے میں اصلاح کرلو، ان کے بارے میں سوچ و بچار کرلو کہ وہ (قیامت) کا دن بھی کیا دن ہوگا؟ اس دن کیلئے جوابات تیار کرلو چونکہ تمہیں اس دن جوابدہ ہونا پڑے گا، تم سے باقاعدہ تفتیش کی جائے گی!''۔

معاشرتی آداب

لوگوں کے ساتھ انسان کے سلوک کو دین کے بزرگان و ہادیان نے جائز قرار دیا ہے اور اس کی بہت زیادہ اہمیت بھی ہے۔اس کے متعلق اصول و ضوابط اور ادب و آداب بھی با قاعدگی سے ذکر ہوئے ہیں، اگر ان کا خیال رکھا جائے تو ایک صحیح و سالم اور خدا کا پسندیدہ معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے، جس سے رُوگردانی بہر حال ممکن نہیں ہے اور اس کا نہ صرف فائدہ نہیں ہے بلکہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ان اصولوں میں سے ایک اصول یہ ہے کہ انسان اپنے ساتھ زندگی بسر کرنے والے معاشرے کے دوسرے افراد کے ساتھ زبانی کلامی محبت کے علاوہ ان پر مالی احسان بھی کرے تا کہ اس کی طرف سے دُوسروں پہ خصوصیت کے ساتھ بخشش و نیکی ثابت ہوں۔

اسی متعلق اقلیم امامت کے ساتویں تاجدار علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿وَاِنْ خَالَطْتَ النَّاسَ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ لَا تُخَالِطَ اَحَدًا مِنْهُمْ اِلَّا مَنْ كَانَتْ يَدُكَ عَلَيْهِ الْعُلْيَا فَافْعَلْ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۵)

''اگر تمہارا لوگوں کے ساتھ معاشرت اور روابط ہیں تو اگر ممکن ہو اور تم ہر ایک کے ساتھ نیکی اور احسان کر سکتے ہو تو یہ کام ہر صورت انجام دو''۔

زبان

آپ نے یقیناً حضرت ابوذرؓ غفاری کا جہاد اور ان کا امر بالمعروف اور نہی از منکر کرنے کا انداز ضرور سُن رکھا ہوگا۔آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ پیغمبر اکرمؐ کے یہ عظیم صحابی اور حضرت علی علیہ السلام کا عاشق دیوانہ کوئی خاموش طبع انسان نہیں تھے بلکہ راہِ حق میں ہمیشہ کچھ کر گزرنے کی تاک میں لگے رہتے اور ہمیشہ سرگرم اور فعال نظر آتے۔جہاں مصلحت دیکھتے کہ اب یہاں کچھ کہنا چاہیئے تو وہیں بے خوف بول پڑتے تھے اور جہاں خاموش رہنے میں مصلحت دیکھتے خاموش ہو جاتے۔ابوذرؓ کتنی عظیم سعادت کے مالک ہیں کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ان کے امر بالمعروف اور نہی از منکر کے بارے میں منقول مواعظ کو اپنی زبان مقدس پہ جاری فرماتے ہیں اور ہشام کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿كَانَ اَبُوْذَرٍ يَقُوْلُ: يَا مُبْتَغِيَ الْعِلْمِ اِنَّ هٰذَا اللِّسَانَ مِفْتَاحُ خَيْرٍ وَ مِفْتَاحُ شَرٍّ فَاخْتِمْ عَلٰى فِيْكَ كَمَا تَخْتِمُ عَلٰى ذَهَبِكَ وَ وَرَقِكَ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۴ تا ۳۹۵)

''حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں: اے لوگو! جو علم و کمال کے متمنی اور خواہش مند ہو جان لو کہ یہ زبان خیر اور شر کی چابی ہے، لہٰذا اپنے منہ کو تالا لگا کر رکھو جیسا کہ تم اپنے پیسوں، سونے اور چاندی والے صندوق کو تالا لگا کر رکھتے ہو''۔

گھٹیا اور گھٹیا ترین

انسان کبھی بھی ایک حالت میں نہیں رہتا۔اس کی مادی اور معنوی لذات بھی دائمی اور ہمیشہ ایک جیسی نہیں ہوتی ہیں اور وہ پریشانیاں جس کا اسے سامنا ہوتا ہے اگر اس کے اختیار سے باہر ہو جائیں تو پھر کوئی چارہ کار نہیں رہتا اور مجبوراً انہیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔مثلاً ایک دولت مند اور بے نیاز قسم کا شخص اگر اپنی دولت و ثروت سے ہاتھ دھو بیٹھے تو یہ بڑی ناگوار شکل اور پریشان کر دینے والی چیز ہوتی ہے اور اگر آنے والے حالات بندے کیلئے اختیاری ہو تو پھر تو بدترین صورت حال بن جائے گی۔ضروری ہے کہ بندہ اس کے انجام کو بھی دیکھ لے، جیسے گناہوں کا ارتکاب ہے۔اس سے بھی بدترین صورت وہ ہے کہ جب انسان توحید پرست ہو، اپنے رب کی عبادت بھی کرتا ہو مگر بعد میں اُسے چھوڑ دے۔

﴿مَا اَقْبَحَ الْفَقْرَ بَعْدَ الْغِنٰى وَاَقْبَحَ الْخَطِيْئَةَ بَعْدَ النُّسْكِ وَاَقْبَحَ مِنْ ذٰلِكَ الْعَابِدُ لِلّٰهِ ثُمَّ يَتْرُكُ عِبَادَتَهُ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۷)

''غنی ہونے کے بعد فقیر ہونا کتنا بدترین ہے، نیک ہونے کے بعد گناہ کرنا اس سے بھی بدتر ہے اور اس سے بھی گھٹیا ترین یہ ہے کہ بندۂ خدا کی عبادت کرتا ہو اور پھر اس عبادت کو ترک کر دے''۔

جسم کی زکوۃ

ہمارے آئمہ اطہار علیہم السلام اور بزرگانِ دین نے لوگوں کو مطالب سمجھانے کی غرض سے مختلف مثالوں اور تشبیہات سے کام لیا ہے تا کہ ان کے مخاطب افراد مطلوبہ مقاصد کو بہتر انداز میں سمجھ سکیں، مثلاً جب ساتویں لعل ولایت مستحبی روزے کے متعلق لوگوں کو سمجھانا چاہتے تھے تو آپؑ نے زکوٰۃ کے موارد میں ایک موردِ کلی طور پر بیان کیا۔ اس کے بعد مستحبی روزے کی وضاحت فرمائی۔ جہاں زکوٰۃ کا لغوی معنی ''زیادتی اور نمو'' کے ہیں اور روزہ ایسے افراد کیلئے جو اسے رکھنے کی طاقت وقدرت رکھتے ہوں مکمل صحت مندی اور اسی تندرستی کا سبب بن جاتا ہے اور اسی تندرستی کے ذریعے بدن طبعی طور پر رُشد اور نمو پاتا ہے۔

اس لئے پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں:

﴿صوموا تَصِحُّوا﴾ (بحارالانوار، ج:۹۳، ص:۲۵۵)

''کہ روزہ رکھو تا کہ صحیح وسالم (اور صحت مند) ہو جاؤ!''۔

﴿لِكُلِّ شَيءٍ زَكَاةٌ وَ زَكَاةُ الْجَسَدِ صِيَامُ النَّوَافِلِ۔﴾ (تحف العقول، ص:۴۰۳)

''ہر چیز پہ زکوٰۃ ہے اور جسم کی زکوٰۃ مستحبی روزے ہیں''۔

خوشگوار زندگی

انسان کی زندگی کی ضروریات انتہائی اساسی اور بنیادی نوعیت کی ہوتی ہیں جیسے غذا، لباس اور گھر، چاروناچار ہر کسی کو ان کی ضرورت پڑتی ہے۔ البتہ ان ضروریات کی فراہمی اور دستیابی معاشرے کے تمام افراد کیلئے یکساں طور پر نہیں ہوتی بلکہ ہر کسی کی اپنی خاص صورتحال ہے اور جس کے تحت ان کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔ کسی کے پاس یہ وسائل وافر مقدار میں موجود ہیں اور کسی کے پاس بالکل تھوڑی مقدار میں۔ لیکن اگر ہم معنویات کی طرف توجہ کریں تو زندگی کے ماحاصل کو اور اس کے شب وروز کے گزرنے کا افراد کی نسبت حساب کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ بعض افراد کی زندگی درحقیقت کامیاب ترین زندگی ہے۔ وہ خود بھی کمال تک پہنچے ہیں اور دوسرے افراد بھی ان کے وجود سے فیضیاب ہو رہے ہیں جبکہ بعض افراد کی زندگی ہمیں بے مقصد اور بے معنی سی لگے گی۔ نہ انہوں نے خود زندگی سے لطف اُٹھایا ہے اور نہ دوسروں کو کسبِ فیض کے مواقع فراہم کئے ہیں۔ امام کاظمؑ کامیاب ترین اور خوشحال ترین زندگی بسر کرنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿لَا خَيْرَ فِي الْعَيْشِ اِلَّا لِرَجُلَيْنِ لِمُسْتَمِعٍ وَاعٍ وَ عَالِمٍ نَاطِقٍ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۷)

''زندگی کی خوشیاں صرف دو قسم کے افراد کیلئے ہیں۔ ایسے سننے والے کیلئے جس کے کان کھلے (جو کچھ سنتا ہے وہ کام میں لاتا ہے) ہیں اور ایسے عالم کیلئے جو بولنے والا ہے (وہ خود اور دوسرے بھی اس کے علم سے فائدہ اُٹھاتے ہیں)''۔

فراوانی

بعض لوگ اپنے کاموں میں بہت ہی گہرے اور اتنے غرق ہوتے ہیں کہ انہیں دنیا سے کسی قسم کا اُنس نہیں ہوتا۔ وہ اس دنیا میں کم سے کم ضروریات زندگی پہ اکتفاء کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے عمل کی دلیل بھی رکھتے ہیں کہ دنیا کے حسن و جمال کو حاصل کرنے کیلئے دنیا میں بہت زیادہ جدوجہد اور مشقت اُٹھانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ قیامت کے دن ہمیں جن کا حساب بھی دینا ہوگا اور ہم باقاعدہ اس کے جوابدہ بھی ہوں گے۔ انسان کیلئے بہتر یہی ہے کہ وہ دُنیا کے حسن وتجملات سے چشم پوشی کر لیں تا کہ قیامت کے دن ان کی جوابدہی اور تفتیش سے بچ سکیں۔

﴿اِنَّ الْعُقَلَاءَ تَرَكُوا فُضُولَ الدُّنْيَا فَكَيْفَ الذُّنُوبُ وَ تَرْكُ الدُّنْيَا مِنَ الْفَضْلِ وَ تَرْكُ الذُّنُوبِ مِنَ الْفَرْضِ۔﴾ (اصول کافی، ج:۱، ص:۱۷)

''عقلاً (جو کچھ ان کیلئے کافی ہے اسی پہ اکتفاء کرتے ہیں) جو کچھ زیادہ ہے اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ چہ جائیکہ گناہ (انہیں ہرگز انجام نہیں دیتے) دُنیا کے حسن سے اجتناب مستحب ہے اور گناہوں کا ترک واجبات میں سے''۔

نقصان اُٹھانے والا

انسانی زندگی کا مادی پہلو کسی بھی لمحے ہمارے آئمہ اطہار علیہم السلام (جو ہمارے اُستاد بھی ہیں) کی توجہ کا مرکز نہیں رہا۔ان کی توجہ ہمیشہ انسان کے معنوی پہلو کی طرف رہی ہے۔اگر کبھی مادی پہلو سامنے آ بھی گیا تو اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ اس سے معنویات کیلئے استفادہ کیا جائے۔ایک مؤمن اور عقلمند انسان اپنی معنوی حقیقت پہ جب نظر کرتا ہے تو وہ سیر صعودی یعنی نیچے سے اُوپر (کمال) کی طرف حرکت کرنا حاصل کر لیتا ہے۔دن بہ دن ترقی کرتا جاتا ہے، خود کو انسانی کمال کی طرف اور معنوی مقامات کی طرف رواں دواں پاتا ہے اور اگر اس انسان کو سیر نزولی یعنی اُوپر سے نیچے کی طرف (پستی) کی طرف حرکت کرنا پڑ جائے اور وہ تنزل کا شکار ہو جائے یا پھر اس کی فکری صلاحتیں کام کرنا چھوڑ دیں اور وہ اپنی جگہ پہ جامد و ثابت رہے تو ایسے انسان نے اپنا نقصان کیا ہے۔

امام موسیٰ علیہ السلام ابن جعفر علیہ السلام اس اہم ترین مطلب کو بڑی آسان عبارت اور مختصر انداز میں بیان فرماتے ہیں:

﴿مَنِ اسْتَوىٰ يَوْمَاهُ فَهُوَ مَغْبُوْنٌ﴾ (بحارالانوار، ج:۷۵،ص:۳۲۷)

''جس بندے کے دو دن برابر گزرے ہوں وہ دھوکے اور نقصان میں ہے''۔

ستم سہنے والا

اگر کوئی بندہ سُنے کہ فلاں پہ ظلم ہوا ہے تو یہ بندہ اور جن پہ خود ظلم ہوا ہے دونوں برابر نہیں ہوں گے۔پہلے گروہ نے صرف سُنا ہے یہ ایسے ہی ہے جیسے وہ دُور سے آگ پہ ہاتھ تاپ رہے ہیں، جبکہ دوسرے گروہ نے ظلم برداشت بھی کیا ہے اور اس لمس اور احساس سے بھی آگاہ ہے۔اُنہوں نے تو ظلم و بربریت کے تھپیڑے صرف دیکھے ہیں جبکہ وہ مظلوم جنھوں نے برداشت کیئے ہیں وہ اس کے عوض اجر اور جزاء بھی پائیں گے۔خداوند کریم ان کی مشکلات اور پریشانیوں کا دنیا و آخرت میں تلافی کریں گے۔

جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہو رہا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ (سورۂ نحل، آیت:۴۱)

''وہ مظلوم افراد جنھوں نے راہِ خدا میں مظالم برداشت کیئے اور راہِ خدا میں (مکہ سے مدینہ) ہجرت کی، ہم دنیا میں بھی انہیں اچھے مقام پر رکھیں گے اور آخرت میں بھی انہیں بہت زیادہ اجر عطا کریں گے اگر یہ جان لیں تو''۔

اس بارے میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

﴿يَعْرِفُ شِدَّةَ الْجَوْرِ مَنْ حُكِمَ بِهِ عَلَيْهِ﴾ (تحف العقول،ص:۴۱۴)

''ظلم کی سختی صرف مظلوم ہی جانتا ہے''۔

سب سے زیادہ ظالم شخص

عقل مند شخص وہ ہے جو کوئی کام کرنے سے پہلے اس کے بارے میں خوب غور و فکر کرتا ہے کہ مبادا کہیں اسے اس کے ردعمل کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے۔ چونکہ اس بُرے کام کے ردعمل کا گناہ بھی تو اسی کی گردن پہ ہے، مثلاً والدین کو چاہئے کہ جو کام ان کے بیٹے کی طاقت سے بڑھ کر ہو اس پہ نہ ڈالیں تاکہ وہ مطلوبہ اور ضروری طاقت و توانائی نہ رکھنے کی صورت میں اپنے والدین کی مخالفت نہ کرے اور ان کے حکم سے رُوگردانی کا ارتکاب بھی نہ کرے۔ایسی صورت میں بیٹے کی نافرمانی کا گناہ والدین کے ذمہ ہوگا۔

عقل مند شخص کبھی بھی کسی کو گالی نہیں دیتا ہے اور نہ ہی کسی کو بُرا بھلا کہتا ہے تاکہ مبادا کہیں غصے میں آ کر اگر اسے اسی انداز میں جواب دیا جائے اور وہی گالیاں اور نازیبا الفاظ اسے پلٹا دیئے جائیں تو اس صورت میں دُوسرے فریق کا گناہ بھی پہلے شخص کے ذمہ ہوگا، البتہ ان دو مذکورہ صورتوں میں دوسرا فریق

اگر صرف جواب دینے پہ اکتفاء کرے تب تو ٹھیک ہے ورنہ اگر دوسرا فریق حدود سے تجاوز کر جائے اور اپنی طرف سے بھی کچھ اضافہ کر دے تو اس اضافے کا وہ خود ذمہ دار ہو گا اور اس کی نسبت گنہگار بھی ہو گا۔

جب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے دو آدمیوں کو دیکھا کہ وہ ایک دوسرے کو گالم گلوچ کر رہے ہیں تو فرمایا:

﴿اَلْبَادِیُ اَظْلَمُ وَ وِزْرُهُ وَ وِزْرُ صَاحِبِهِ عَلَيْهِ مَا لَمْ يَعْتَدِ الْمَظْلُومُ....﴾ (تحف العقول، ص:۴۱۲)

''جس بندے نے گالم گلوچ کا آغاز کیا ہے وہ زیادہ ظالم شخص ہے، اس کے ذمہ اپنا گناہ بھی ہے اور مدمقابل کا گناہ بھی، جب تک مدمقابل شخص زیادتی نہیں کر جاتا''۔

اچھائیوں کا سرچشمہ

ہمارے ہادیانِ برحق کے فرامین سے یہ استنباط ہوتا ہے کہ خدا کی عطا کردہ نعمات میں عقل کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ عقل کے ذریعے نہ صرف دنیا کی سعادتیں حاصل کی جا سکتی ہیں بلکہ آخرت میں بھی انسان سُرخرو ہو سکتا ہے۔ چونکہ عقل کے ذریعے انسان خدا کو پہچانتا ہے، اس کی عبادت کرتا ہے اور اسی کے ذریعے اس کا اخلاق بھی سنورتا ہے۔

﴿مَنْ اَرَادَ الْغِنٰی بِلَا مَالٍ وَ رَاحَةَ الْقَلْبِ مِنَ الْحَسَدِ وَالسَّلَامَةَ فِي الدِّيْنِ فَلْيَتَضَرَّعْ اِلَی اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فِي مَسْاَلَتِهِ بِاَنْ يُكَمِّلَ عَقْلَهُ فَمَنْ عَقَلَ بِمَا يَكْفِيْهِ وَ مِنْ قَنِعَ بِمَا يَكْفِيْهِ اسْتَغْنٰی وَ مَنْ لَمْ يَقْنَعْ بِمَا يَكْفِيْهِ لَمْ يُدْرِكَ الْغِنٰی اَبَدًا﴾ (اصول کافی، ج:۱، ص:۱۸)

''جو کوئی چاہتا ہے کہ اُسے بغیر مال و دولت کی بے نیازی، بغیر حسد کے آسودہ خاطر اور سالم دین نصیب ہو تو وہ خدائے تعالیٰ سے اپنی عقل کی تکمیل کیلئے دُعا کرے، چونکہ ایک عقلمند شخص اپنی کافی آمدنی پر گزارہ کر لیتا ہے اور جو کوئی اپنی آمدنی پر اکتفاء کرے خوشحالی محسوس کرتا ہے وہ بے نیاز ہو جاتا ہے اور جو کوئی اپنی کافی آمدنی پر قناعت نہ کرے وہ کبھی بھی بے نیاز نہیں ہوتا ہے (یعنی ہمیشہ محتاج ہی رہتا ہے)''۔

عقل اور سوچ بچار کی سرکوبی

انسان کو اپنے گوہرِ نایاب (عقل) کی قدر و قیمت معلوم ہونی چاہئے اور جو چیز بھی عقل کی سرگرمی میں رُکاوٹ بنے اس سے اجتناب کرے تاکہ اس کی سرگرمی اور کام کرنے کیلئے وسیع میدان مہیا ہو سکے اور انسان اس اہم ترین نعمت کے آثار سے بہرہ مند ہو سکے۔

﴿مَنْ سَلَّطَ ثَلَاثًا عَلٰی ثَلَاثٍ فَكَاَنَّمَا اَعَانَ عَلٰی هَدْمِ عَقْلِهِ اَظْلَمُ نُوْرَ وَ مَنْ تُفَكُّرِهِ بِطُوْلِ اَمَلِهِ وَ مُخَاطِرَتُفَ حَكْمَتِهِ بِفُضُوْلِ كَلَامِهِ وَ اَطْفَا عِبْرَتِهِ بِشَهَوَاتِ نَفْسِهِ فَكَاَنَّمَا اَعَانَ هَوَاهُ عَلٰی هَدْمِهِ عَقِلَهِ وَ مَنْ هَدَمَ وَاهْزَ عليه دِيْنَهُ وَ دُنْيَاهُ﴾ (اصول کافی، ج ۱، ص:۱۷)

''جس شخص نے تین چیزوں کو تین چیزوں پر مسلّط کر دیا گویا اس نے اپنے عقل کی بربادی میں خود مدد کی ہے (پہلا) وہ شخص کہ جس نے اپنے نورِ تفکر کو طولانی خواہشات سے تاریک کر دیا (دوسرا) جس نے اپنی حکیمانہ گفتگو کو بیہودہ اور لغو کلام کے ذریعے مٹا دیا اور نورِ عبرت کو خواہشاتِ نفسانیہ کے ذریعے خاموش کر دیا، اس کی مثال ایسے شخص جیسی ہے جو اپنی ہوا و ہوس کے ذریعے اپنی عقل کو ختم کرنے میں مدد کرتا ہے، جس شخص نے اپنی عقل کا خاتمہ کر دیا گویا اس نے اپنے دین و دنیا دونوں کو تباہ کر لیا''۔

بدمستی

انسان کو ہمیشہ اپنے اعمال کی خودنگرانی کرنی چاہئے۔ فارسی کی اصطلاح ہے کہ: **''پا از گلیم خویش بیرون ننهد''** یعنی اپنی چادر سے پاؤں باہر نہیں نکالنے چاہئے یا چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہئے!۔ اور کسی لمحے بھی اپنی انسانیت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے اور کسی بھی لمحے اپنے رب کی یاد اور اپنے مالک کی ضرورت کو فراموش نہ کرے۔ مثال کے طور پر بعض افراد فقر و تنگ دستی کی حالت میں دنیا میں قدم رکھتے ہیں اور بچپن سے ہی فقیر پلتے ہیں، جونہی مال و دولت ان کے ہاتھ آتا ہے (تو چونکہ یہ لوگ بے نیازی کی ظرفیت نہیں رکھتے ہیں ان کے اندر مال و متاع پانے کی استعداد نہیں ہوتی یہ کم ظرف لوگ ہوتے ہیں) ان کی نفسیات پہ یہ نئی حالت ایک عجیب و غریب اثر دکھاتی ہے جسے فارسی میں کہتے ہیں **''خود را گم کنند''** یعنی اپنا آپ فراموش کر بیٹھے

ہیں'' اور اکثر تو اخلاقی اور مذہبی اصولوں کو بھی روند ڈالتے ہیں۔ مقام و منزلت کے دلدادہ افراد میں سے بعض کی یہی خصوصیت ہوتی ہے۔ ہاں! انسان اگر چاہتا ہے کہ وہ خطاؤں سے محفوظ رہے تو ضروری ہے کہ اپنے رب کے حضور پناہ لے اور اپنے سرکش نفس کی مہار اپنے ہاتھوں میں رکھیں۔

﴿مَنْ وَلَّدَهُ الْفَقْرُ اَبْطَرَهُ الْغِنٰى۔﴾ (بحارالانوار، ج:۷، ص:۳۴۳)

''جو بندہ فقر و ناداری میں پیدا ہوا اِسے بے نیازی اور دولت مندی بدمست بنا دیتی ہے''۔

نہایت مناسب رویّہ

حیاء انتہائی اہم اور پسندیدہ صفات میں سے ایک ہے۔ اگر یہ صفت کسی کے اندر پائی جائے تو ایسا شخص خطاؤں سے محفوظ رہتا ہے۔ دلیل سے ثابت ہے کہ شرم و حیاء خدا کی ذات سے ہوتا ہے جس کے سبب انسان گناہوں سے اجتناب کرتا ہے اور اپنے دامن کو گناہوں سے کبھی آلودہ نہیں ہونے دیتا۔ لہٰذا اس صفت کو کبھی چھوٹا یا حقیر نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ ہمیشہ یہ کوشش ہونی چاہئے کہ انسان جو قدم بھی اُٹھائے اپنے رب کو حاضر و ناظر سمجھتے ہوئے اُٹھائے۔ اپنے رب سے شرم و حیاء کرے، کوئی بھی غلط کام نہ کرے۔ دوسرا یہ کہ انسان نعمتوں میں غرق ہے اور خداوند کریم جب انسان پہ اپنا لطف فرماتے ہیں تو اس کو نعمت عطا کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی زندگی آسان ہو جاتی ہے، اس موقع پر انسان کو ان افراد کو یاد رکھنا چاہئے جو ان نعمتوں سے محروم چلے آرہے ہیں اور حتی المقدور ان کی مدد کرنی چاہئے۔

﴿يَنْبَغِيْ لِلْعَاقِلِ اِذَا عَمِلَ عَمَلاً اَنْ يَسْتَحْيِيَ مِنَ اللّٰهِ وَ اِذَا تَفَرَّدَ لَهُ بِالنِّعَمِ اَنْ يَشَارِكَ فِيْ عَمَلِهِ اَحَدًا غَيْرَهُ۔﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۸)

''ایک عقلمند شخص کیلئے مناسب یہ ہے کہ جب وہ کوئی (غلط) کام انجام دینا چاہے تو خداوند کریم سے شرم محسوس کرے (صرف اس صورت میں جب یہ کام جرم ہو) جب اسے کوئی نعمت عنایت کر دی جائے تو اس سے استفادہ کرتے وقت دوسرے افراد کو بھی شریک کرے''۔

خدا تعالیٰ کی سفارش

خداوند کریم ہمیشہ لوگوں کو دنیا کی ناپائیداری اور آخرت کی پائیداری کی طرف متوجہ کرتے رہے ہیں تاکہ لوگ جان سکیں کہ یہ دنیا عارضی اور وقتی ہے اور آخرت دائمی و ابدی ہے جس کے نتیجے میں لوگ ہمیشہ اپنی آخرت کی فکر میں غلطاں رہیں۔ دنیا کو صرف اپنی اُخروی کامیابی کیلئے وسیلہ و ذریعہ بنائے رکھیں۔ عقلی طور پر اس نصیحت کو قبول کرتے ہوئے اس پر عمل پیرا رہیں اور آخرت کی کامیابی کو حاصل کر سکیں، جبکہ احمق اور بے وقوف شخص اس دنیا کی زندگی پہ مرمٹتا ہے اور آخرت کی نسبت لاپرواہ ہو جاتا ہے، نتیجتاً اس کی آخرت تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

﴿ثُمَّ وَعَظَ اَهْلَ الْعَقْلِ وَ رَغَّبَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ﴾ (اصول کافی، ج:۱، ص:۱۴)، ﴿فَقَالَ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَعِبٌ وَ لَهْوٌ وَ لَلدَّارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (سورۂ انعام، آیت:۳۲)

''پھر (پروردگار) عقلا کو وعظ و نصیحت فرماتے ہیں اور انہیں آخرت کی طرف رغبت دلاتے ہیں اور کہتے ہیں: دنیا کی زندگی صرف کھیل کود اور مصروفیت کے سوا کچھ بھی نہیں اور آخرت کی سرائے متقی افراد کیلئے بہترین جگہ ہے کیا تم غور و فکر نہیں کرتے ہو؟''۔

سقوط (گرنا)

سب جانتے ہیں کہ نازیبا کلمات (گالم گلوچ) انسان کے وقار اور شرافت کو ختم کر دیتے ہیں اور اسے ذلت و پستی کی طرف دھکیل دیتے ہیں اور انسان کو ایک ایسی چیز کی طرح بنا دیتے ہیں جس کے لیے کسی قسم کی حدود و قیود اور حدود حریم کی پابندی نہیں ہوتی اور وہ انسان ایک بے قیمت اور بے وقعت چیز کی مانند بن جاتا ہے۔ مثلاً اگر دو بندے ایک دوسرے سے جھگڑا کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو گھٹیا اور نازیبا کلمات کہنا شروع کر دیں اور فرق یہ ہے کہ ان میں سے ایک شریف اور محترم و معزز شخص ہو جبکہ دوسرا عام گھٹیا اور بازاری انسان ہو تو جو بندہ محترم اور معزز ہے وہ اپنے ناشائستہ عمل اور غیر دانشمندانہ حرکت کے ذریعے اپنے آپ کو اپنے مدمقابل (گھٹیا) شخص سے بھی نیچے گرا دیتا ہے۔ پس اس کے پاس جتنا بلند و بالا مقام تھا اسی رفتار سے اس کا گراف نیچے گر جاتا ہے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اس مطلب کو ایک خوبصورت مگر چھوٹے سے جملے میں یوں ادا فرماتے ہیں:

﴿مَا تَسَابَّ اثْنَانِ اِلاَّ انْحَطَّ اَلْاَعْلٰی مَرْتَبَۃِ الْاَسْفَلِ۔﴾ (بحارالانوار، ج:۷۵،ص:۳۳۳)

''جب دو بندے ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں تو ان میں سے جو بلند مرتبے والا ہے اس کا مرتبہ گھٹیا مرتبے والے شخص کے گھٹیا مرتبہ کے برابر نیچے گر جاتا ہے''۔

دُنیا کی تصویر

ہمارے آئمہ اطہار علیہم السلام اور بزرگان دین نے اپنی گفتگو میں مثالیں، استعارے اور خوبصورت کنائے استعمال کیئے ہیں تاکہ سننے والے کو مطالب کی حقیقت اور گہرائی تک پہنچنے میں آسانی محسوس ہو۔ اس قسم کی گفتگو کی نوعیت پہ بہت غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ان مثالوں کی علل اور وجہ تشبیہ کو مشخص اور معین کیا جاسکے اور کلام کی ظرافت اور لطافت کا کماحقہ لطف اُٹھایا جاسکے۔

جیسے حضرت علی علیہ السلام دنیا کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

''دنیا کی مثال سانپ کی سی ہے جس کے جسم کی جلد نرم و ملائم ہوتی ہے اور اس کے اندر زہر بھرا ہوتا ہے''۔ (نہج البلاغۃ: ۴۵۸)

ساتویں تاجدار ولایت علیہ السلام دنیا کی مثال اس طرح سے دیتے ہیں:

(مَثَلُ الدُّنْیَا مِثْلُ مَاءِ الْبَحْرِ کُلَّمَا شَرِبَ مِنْہُ الْعَطْشَانُ ازْدَادَ عَطَشًا حَتّٰی یَقْتُلَہُ۔) (تحف العقول،ص:۳۹۷)

''دُنیا کی مثال سمندر جیسی ہے جو بھی تشنہ وہاں سے سیراب ہونا چاہے گا اس کی تشنگی میں اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جائے گا حتیٰ کہ اسے ہلاک ہونا پڑے گا''۔

جلد بازی

انسان جب اپنی خواہشوں اور آرزوؤں کی تکمیل کرنے لگتا ہے اور دوسری طرف اپنی عمر کی تھوڑی مدت کو بھی مدنظر رکھتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ ان سب کو اس چھوٹی سی عمر (تھوڑے سے عرصے میں) میں عملی جامہ پہنانا ممکن نہیں ہے تو اس وقت وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنی ان آرزوؤں اور خواہشات سے دستبردار ہو جائے، البتہ بعض حضرات تو اپنی خواہشات میں اس قدر غرق نظر آتے ہیں کہ ان کی سوچ و بچار پہ ہمیشہ وہ خواہشات ہی چھائی رہتی ہیں کہ اس سارے عرصے میں اسے کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ کوئی اس کا محاسبہ کرنے والا بھی موجود ہے۔ اس لئے آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ انسان عمر کے جس حصے میں بھی فوت ہو جائے اس کی بہت سی آرزوئیں ہنوز تشنہ نظر آتی ہیں اور مرتے وقت کوئی بھی شخص ایسا نہیں ملے گا جس کی تمام خواہشات پوری ہو چکی ہوں اور اس وقت اس کی کوئی آرزو نہ ہو۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے ۔۔۔ بہت نکلے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

(غالب/مترجم)

﴿لَوْ رَاَیْنَا مُسِیْرَ الْاَجَلِ لَاَلْھَاکَ عَنِ الْاَمَلِ۔﴾ (تحف العقول،ص:۳۹۹)

''اگر تم موت کی حرکت اور آگے بڑھنے (جو تمہاری طرف بڑھ رہی ہے اور خود کو تم تک پہنچانا چاہ رہی ہے) کے عمل کو ملاحظہ کر سکو تو موت تمہیں اپنے ساتھ مشغول کرے گی اور تمام آرزوؤں اور خواہشات سے دُور رکھے گی''۔

خدا سے شرم کرنا

انسان یہ کوشش کیوں کرتا ہے کہ کسی طرح اس کے بُرے اور گھٹیا کام کبھی آشکار نہ ہونے پائیں؟ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر لوگ اس کے کردار اور بُرے کاموں سے آگاہ ہو گئے تو اس کی سرزنش کریں گے جس کے نتیجے میں اسے شرمندگی اور رُسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پس انسان کو چاہئے کہ وہ تمام بُرے کاموں کے نتائج کو مدنظر رکھے اور انہیں خفیہ انداز میں (بھی) ہرگز انجام نہ دے۔ خدا تو آشکار اور پنہاں دونوں سے آگاہ ہے۔ اس ذات کیلئے خلوت اور

جلوت دونوں برابر ہیں، کوئی چیز اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے، انسان کو بذات خود شرم محسوس کرنی چاہئے۔ خوش بخت اور سعادت مند وہ انسان ہے جو ہمیشہ اسی فکر میں غلطاں رہتا ہے اور اس سے لحہ بھر بھی غافل نہیں ہوتا، اس طرح وہ گناہوں سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے اور نیکی کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔

﴿فَاسْتَحْيُوْا مِنَ اللّٰهِ فِيْ سَرَائِرِكُمْ كَمَا تَسْتَحْيُوْنَ مِنَ النَّاسِ فِيْ عَلَانِيَتِكُمْ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۴)

''جس طرح تم ظاہری طور پر لوگوں سے (اپنے بُرے کاموں پہ) شرم محسوس کرتے ہو جب انہیں چھپ کر انجام دیتے ہو اس وقت اپنے خدا سے بھی شرم محسوس کیا کرو!''۔

صبر و شکر

اگر ایک انسان ہر حالت میں اپنے رب کریم کو یاد رکھتا ہے تو یہ اس کے پروردگار کا خصوصی لطف شمار ہوگا اور جب انسان مسلسل جدوجہد کر کے حلال طریقے سے کوئی چیز حاصل کر لے تو اسے جان لینا چاہئے کہ یہ اس کا کمال نہیں ہے بلکہ خدا کی عطا کردہ نعمت ہے اور رب کریم کا خصوصی فضل و کرم ہے جو اسے عطا کی گئی ہے اس کا شکریہ بجالانا بھی ضروری ہے۔ اور اگر اس لمحے اس کے سامنے حرام آئے تو اسے ہرگز قبول نہ کرے اور خود کو اس سے روکے رکھے، صبر سے کام لے اور خود کو معصیت و گناہ کی وادی میں قدم رکھنے سے باز رکھے اور اس سے نظریں چرا لے۔ جس انسان نے دو متضاد قطب ''حلال و حرام'' کے درمیان زندگی بسر کرتے ہوئے اپنے دین پہ عمل کیا اور اپنا حقیقی فریضہ انجام دیا تو اس کے بارے میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلامفرماتے ہیں:

﴿إِنَّ الْعَاقِلَ الَّذِيْ لَا يَشْغَلُ الْحَلَالُ شُكْرَهُ وَلَا يَغْلِبُ الْحَرَامُ صَبْرَهُ﴾ (اصول کافی، ج:۱، ص:۱۶)

''عقل مند شخص وہ ہے جس کو حلال شکر سے نہ روکے اور حرام اس کے صبر پہ غالب نہ آنے پائے''۔

تعجب

ایک عقلمند انسان اپنے لگے بندھے انداز میں زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے تمام کاموں کو عقل و دِرَایت کی روشنی میں انجام دیتا ہے اور جب یہ دیکھتا ہے کہ فلاں شخص عقل و منطق کی رُو سے اپنے امور انجام نہیں دے رہا تو یہ تعجب کا اظہار کرتا ہے کہ یہ شخص بے راہ روی کا شکار کیوں ہے اور گمراہی کے راستے پہ کیوں چل رہا ہے؟

البتہ ایک جاہل جو اپنی جہالت میں غلطاں رہتا ہے اور بغیر کسی نظم و ضبط اور فیصلے کے ہر کام میں ہاتھ ڈال دیتا ہے اور جب وہ ایک عقلمند انسان کے معاملات کو دیکھتا ہے اور اس کے تمام امور ایک منظم اور مرتب انداز میں چل رہے ہیں تو وہ متوجہ ہوتا ہے کہ عقلمند شخص بعض کاموں سے اجتناب کرتا رہا ہے اور بعض کاموں کو بڑی دلچسپی سے انجام دے رہا ہے تو یہ بہت زیادہ تعجب کا اظہار کرتا ہے، چونکہ یہ علماء و عقلا کی دنیا سے بے خبر تھا۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلامفرماتے ہیں:

﴿تَعَجُّبُ الْجَاهِلِ مِنَ الْعَاقِلِ اَكْثَرُ مِنْ تَعَجُّبِ الْعَاقِلِ مِنَ الْجَاهِلِ﴾ (تحف العقول، ۴۱۴:)

''جاہل کا عقلمند پہ اظہار تعجب عقلمند کے جاہل پہ تعجب سے کہیں زیادہ ہوتا ہے''۔

مذاق

اگر مذاق اپنے مقرر کردہ حدود کے اندر رہو، اس میں جھوٹ اور باطل گفتگو کی آمیزش نہ ہو، دوسروں کو خوش کرنے اور ان کی دل ربائی کی غرض سے ہو تو اخلاقی لحاظ سے ہرگز ممنوع نہیں ہے۔ پیغمبر اکرم بھی تو مذاق فرمایا کرتے تھے اور ساتھ یہ بھی فرمایا کرتے تھے ''میں مذاق کرتا ہوں مگر پھر بھی حق بات کہتا ہوں، کہ میرا مذاق بھی حق پہ مبنی ہوتا ہے''۔ (جامع السعادات، ج:۲، ص:۲۹۱)

البتہ اگر مذاق میں افراط سے کام لیا جائے یا اس میں جھوٹ اور باطل گفتگو کی آمیزش کی جائے، اس میں تہمت، الزام اور ناحق گفتگو کی بُو آتی ہو تو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ انسان کی عزت کو ختم کر دیتی ہے اور دشمنی اور بغض و کینہ کی بنیاد رکھ دیتی ہے بلکہ کبھی تو اس میں باقاعدہ مسخرے پن اور استھزاء کا رنگ نمایاں ہو جاتا ہے تو اس قسم کا مذاق اخلاقی حدود و قیود سے تجاوز سمجھی جائے گی اور ممنوع شمار کی جائے گی۔

اس قسم کے مذاق کے متعلق امام ہفتم علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿إِيَّاكَ وَالْمَزَاحَ فَإِنَّهُ يُذْهِبُ بِنُورِ إِيمَانِكَ وَ يَسْتَخِفُّ مُرُوَّتَكَ۔ ﴾ (تحف العقول،ص:۴۰۹)

''مذاق سے پرہیز کرو، یہ تمہارے ایمان کے نور کو ختم کردے گا اور تمہاری مردانگی کو سلب کردے گا''۔

صدر نشین

انسان کی زندگی کا ہر پہلو چاہے اجتماعی ہو یا انفرادی اس کیلئے کچھ اصول وضوابط اور حدود و قیود موجود ہیں جن سے تجاوز اور ان کی مخالفت اجتماعی آداب و رسوم اور حدود و قیود سے بغاوت سمجھی جائے گی۔ان میں سے مثلاً ایک قاعدہ و قانون یہ ہے کہ بزرگ ہمیشہ صدر مجلس کی مسند پہ تشریف فرما ہوتے ہیں۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَقُولُ:

لَا يَجْلِسُ فِي صَدْرِ الْمَجْلِسِ إِلَّا رَجُلٌ فِيهِ ثَلَاثُ خِصَالٍ، يُجِيبُ إِذَا سُئِلَ وَ يَنْطِقُ إِذَا عَجَزَ الْقَوْمُ عَنِ الْكَلَامِ وَ يُشِيرُ بِالرَّأْيِ الَّذِي فِيهِ صَلَاحُ أَهْلِهِ فَمَنْ لَمْ يَكُنْ فِيهِ شَيْءٌ مِنْهُنَّ فَجَلَسَ فَهُوَ أَحْمَقُ﴾ (تحف العقول،ص:۳۸۹)

''حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

جس شخص میں تین صفات نہ پائی جائیں وہ کسی بھی مجلس کی صدر نشست پہ نہ بیٹھے:۔

(۱) جب اس سے کسی چیز کے بارے میں سوال کیا جائے تو وہ اس کا جواب دے۔

(۲) جب لوگ کسی موضوع پہ گفتگو کرنے سے عاجز آجائیں تو یہ گفتگو کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور گفتگو کرے۔

(۳) جب اصلاح کی غرض سے اس سے رائے طلب کی جائے تو صحیح رائے دے۔جس میں مندرجہ بالا تین صفات میں سے ایک بھی نہ پائی جائے، اگر وہ کسی محفل میں نشست صدارت پہ جا بیٹھا ہے تو وہ احمق ہے''

خدا سے ضد کرنا

بعض احمق اور فکر سے عاری قسم کے انسان جن کے اندر حقائق کو پرکھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور وہ اخلاقی قدروں اور موازین سے دُور ہوتے ہیں ایسے اعمال انجام دیتے ہیں جو ان کی اپنی نظر میں تو درست وصحیح ہوتے ہیں جبکہ حقیقت میں وہ بالکل صحیح نہیں ہوتے ہیں۔مثلاً وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ خود تو عظیم شخصیت کے مالک ہیں جبکہ دوسرے ان کے مقابلے میں حقیر انسان ہیں یا پھر وہ لوگوں سے ہمیشہ شاہانہ اور بڑا پن ظاہر کرتے ہوئے بات چیت کرتے ہیں اور اُن کے سامنے فخر ومباہات کا اظہار کرتے ہیں جبکہ عقلمند اور تجربہ کار قسم کے لوگ خود کو کبھی بھی دوسروں سے برتر اور افضل نہیں سمجھتے ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ عظمت و بڑائی صرف ذاتِ خدا کیلئے ہے اور اسی ذات پر صفات کے شایانِ شان ہے،جبکہ انسان تو ایک کمزور سی چیز ہے اور اس ضعف و انکساری کے باوجود خود کو بڑا اور برتر سمجھنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

اس سلسلے میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿مَنْ تَكَبَّرَ عَلَىٰ إِخْوَانِهِ وَاسْتَطَالَ عَلَيْهِمْ فَقَدْ ضَادَّ اللّٰهَ﴾ (تحف العقول،ص:۳۹۷)

''جو بندہ اپنے دوستوں اور دینی بھائیوں پہ خود کو برتر اور متکبر ظاہر کرے اور ان کے مقابلے میں بزرگی اور بڑائی کا اظہار کرے تو اس نے گویا اپنے رب کے ساتھ ضد کی ہے''۔

ٹھکرایا ہوا

مؤمن اور فرض شناس (ذمہ دار) قسم کا انسان ہمیشہ خداوند کریم کے لطف و کرم کے زیرِ سایہ رہتا ہے جبکہ وہ لوگ جو خلاف شرع اور گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں خود کو خداوند کریم کی رحمت کے حریم سے دُور کردیتے ہیں اور خداوند کریم کا لطف و کرم ان سے سلب کرلیا جاتا ہے اور وہ خدا کی لعنت کے مستحق قرار

پاتے ہیں۔ بروزِ قیامت ایسے افراد مشکلات کا شکار ہو جائیں گے۔ ہاں! اگر اپنی بقیہ زندگی توبہ میں گزار دیں تو پھر نجات ممکن ہے۔

مَلْعُوْنٌ مَنِ اتَّهَمَ أَخَاهُ　　مَلْعُوْنٌ مَنْ غَشَّ أَخَاهُ

مَلْعُوْنَ مَنْ لَمْ يَنْصَحْ أَخَاهُ　　مَلْعُوْنٌ مَنِ اغْتَابَ أَخَاهُ

(بحارالانوار، ج:۷۵، ص:۳۳۳)

''جو شخص اپنے دینی بھائی پہ تہمت لگائے وہ ملعون ہے (یعنی خدا کی رحمت سے دُور ہے)، جو شخص اپنے دینی بھائی سے خیانت کرے وہ ملعون ہے، جو بندہ اپنے دینی بھائی کا خیر خواہ نہ ہو وہ ملعون ہے، جو اپنے دینی بھائی کی غیبت کرے وہ بھی ملعون ہے''۔

عقلمند

عقلمند شخص اپنے تمام امور عقل کی راہنمائی میں انجام دیتا ہے۔ اسی دلیل کی بناء پر وہ ہمیشہ کامیاب و کامران قرار پاتا ہے۔ وہ خود ہمیشہ سچی گفتگو کرتا ہے، دوسروں سے بھی کبھی بے جا تقاضے نہیں کرتا ہے، بے موقع وعدے وعید نہیں کرتا اور ایسے کام جن کی چنداں اہمیت نہ ہو اور اس کیلئے زیادہ زحمت بھی نہ اُٹھانی پڑے پھر بھی اسے نہ ہی پسند کرتا ہے اور نہ ہی ان کا تعاقب کرتا ہے۔

ایسے حکیمانہ کلمات کو امام ہفتم علیہ السلام خوبصورت اور حسین پیرائے میں بیان فرماتے ہیں تاکہ عام لوگوں کو سمجھنے میں آسانی ہو:

﴿إِنَّ الْعَاقِلَ لَا يُحَدِّثُ مَنْ يَخَافُ تَكْذِيْبَهُ وَ لَا يَسْأَلُ مَنْ يَخَافُ مَنْعَهُ وَ لَا يَعِدُ مَا لَا يَقْدِرُ عَلَيْهِ وَ لَا يَرْجُوْ مَا يُعَنَّفُ بِرَجَائِهِ۔﴾

(اصول کافی، ج:۱، ص:۲۰)

''عقل مند ایسے شخص سے گفتگو نہیں کرتا جس کے بارے میں ڈر ہو کہ وہ اسے جھٹلا دے گا (یعنی جب کہنے والا جانتا ہو کہ میری گفتگو سے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہوں گے) اور ایسے شخص سے کبھی سوال نہیں کرتا جس کے بارے میں جانتا ہو کہ وہ نہیں دے گا اور جس چیز کو بجا نہیں لا سکتا اس کا وعدہ بھی نہیں کرتا اور وہ چیز جو انہیں مشکل و زحمت میں ڈال دے گی پسند نہیں کرتا اور اسے پالینے کی آرزو اور کوشش ہرگز نہیں کرتا''۔

دنیا پرست عالم

عالم کا لغوی معنی جاننے والا کے ہیں۔ جو بندہ جو کچھ جانتا ہے اس چیز کی نسبت سے وہ عالم ہے مگر قرآن مجید اور آئمہ اطہار علیہم السلام کے فرامین میں عالم سے مُراد وہ مذہبی رہنما ہے جو باقاعدہ دینی علوم کو حاصل کرتا ہے اور پھر یہ علوم لوگوں کو سکھاتا ہے۔ درحقیقت وہ خدا اور مخلوق کے درمیان واسطہ اور رابطہ ہوتا ہے۔ ایسا شخص خدا شناس، متقی، اللہ والا اور معنویات کا دلدادہ ہونا چاہئے۔ یہ مادیات سے مکمل طور پر دُور رہتا ہے۔

﴿أَوْحَى اللّٰهُ إِلَىٰ دَاوُدَ قُلْ لِعِبَادِيْ:

لَا تَجْعَلُوْا بَيْنِيْ وَ بَيْنَهُمْ عَالِمًا مَفْتُوْنًا بِالدُّنْيَا، فَيَصُدَّهُمْ عَنْ ذِكْرِيْ وَ عَنْ طَرِيْقِ مَحَبَّتِيْ وَ مُنَاجَاتِيْ أُولٰئِكَ قُطَّاعُ الطَّرِيْقِ مِنْ عِبَادِيْ بِاَنَّ اَدْنٰى مَا اَنَا صَانِعٌ بِهِمْ اَنْ اَنْزَعَ حَلَاوَةَ مَحَبَّتِيْ وَ مُنَاجَاتِيْ مِنْ قُلُوْبِهِمْ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۷)

''خداوند کریم نے حضرت داؤد علیہ السلام کو وحی کی کہ میرے بندوں سے کہہ دو کہ:

وہ اپنے اور میرے درمیان دنیا پرست علماء کو واسطہ اور وسیلہ ہرگز نہ قرار دیں، یہ میرے بندوں کو میری یاد سے اور میری محبت کی راہوں سے میری مناجات سے روک دیں گے، ایسے لوگ (علماء) میرے بندوں کیلئے راہزن [1] ہیں، میری طرف سے ان کیلئے کم از کم عذاب یہ ہے کہ میں ان کے دلوں سے اپنی محبت اور مناجات کی مٹھاس و چاشنی ختم کر دیتا ہوں''۔

---

[1] آج کل ہمارے ہاں جو صاحبان محراب و منبر چھائے ہوئے ہیں قارئین کرام خود فیصلہ کریں کہ وہ کس معیار پر اُترتے ہیں، کیا انتظامیہ کو ایسے ہی صاحبان محراب و منبر کی حوصلہ افزائی کرنا چاہئے جو دین کی آڑ میں دُنیا کماتے ہیں؟ (مترجم)

پسندیدہ تحفہ

دوسروں سے نیکی اور محبت کرنے کیلئے بھی چند شرائط ہیں۔ اگر یہ شرائط پوری مہیا ہو جائیں تو احسان اور نیکی کرنے والے کا اجر وثواب دو برابر ہو جائے گا۔ ان شرائط میں ایک یہ ہے کہ نیکی چھپ کر کرے، اس طرح کہ دوسروں کو پتہ نہ چلے اور لوگوں کی نظروں کے سامنے نہ انجام دے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ جب یہ نیکی کرنے والا کسی سے نیکی کا وعدہ کرے تو اسے ضرور انجام دے یا اسے کوئی چیز دینے کا وعدہ کرے تو وہ چیز ضرور دے یعنی اپنا وعدہ وفا کرے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ان دو مطالب کو واضح الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

﴿مَنْ كَتَمَ مَا أَوْلَاهُ مِنْ ضِيعَةٍ فَقَدْ كَرُمَ فِعَالُهُ وَ مَنْ عَجَّلَ مَا وَعَدَ فَقَدْ هَنِئَ الْعَطِيَّةَ﴾ (تحف العقول، ص:۴۰۳)

''جو بندہ چھپ کر نیکی و احسان کرتا ہے (اس کو خود ظاہر نہیں کرتا) وہ عظیم اور با کردار شخص ہے۔ اور جو بندہ نیک وعدہ کرتا ہے پھر اسے پورا کرنے کی جلدی کرتا ہے اس کیلئے عملی قدم اُٹھاتا ہے یہ ایسا عطیہ اور بخشش ہے جو پسندیدہ اور لذت بخش بنا دیا جائے گا''۔

اصلاح اور معاف کرنا

قرآن کریم میں معاف اور عفو و درگزر کے متعلق کئی آیات نازل ہوئی ہیں اور دین کے ہادیوں کی زبان مبارک سے مختلف الفاظ وعبارات میں عفو و درگزر کو ایک پسندیدہ صفت اور انسانی شرافت کا سر چشمہ سمجھتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ ایسے افراد جن کے درمیان کدورت پائی جاتی ہے ان کے باہمی تعلقات اچھے نہیں ہیں، نفرت اور بغض کا شکار ہیں۔ محبت و پیار کی نبیاد رکھنے کو پسندیدہ اور ممدوح صفت قرار دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی نشانی ہے کہ معاشرے اور اپنی دینی بھائیوں کے درمیان محبت و اخوت کے رشتے استوار کرنے والا شخص دلسوز اور مہربان شخصیت کا مالک ہوتا ہے، وہ کبھی بھی لوگوں کے درمیان باہمی روابط کی شکست و ریخت پہ راضی نہیں ہوتا۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے بہت خوبصورت عبارت میں ان دو موضوعات اور ان کے اجر وثواب کو بیان کیا ہے، فرماتے ہیں:

﴿يُنَادِيْ مُنَادٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَلَا مَنْ كَانَ لَهُ عَلَى اللّٰهِ أَجْرًا فَلْيَقُمْ فَلَا يَقُوْمُ إِلَّا مَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ﴾ (تحف العقول، ص:۴۱۲)

''قیامت کے دن منادی ندا دے گا: جو بندہ خداوند کریم سے اجر اور مزدوری کا طلبگار ہے وہ اٹھے لوگوں میں سے صرف وہ بندہ اُٹھے گا جس نے عفو و درگزر کیا ہوگا اور معاشرے کے چند یا دو آدمیوں کے درمیان صلح کی ہوگی وہ اُٹھے گا اور اپنے رب سے اس کا اجر پائے گا''۔

انبیاء علیہم السلام کی عقلی وفکری برتری

انبیاء علیہم السلام عقلی اور فکری لحاظ سے ممتاز درجے پہ فائز ہوتے تھے۔ اسی طرح وہ مقام نبوت پہ فائز ہونے کی لیاقت واستعداد رکھتے تھے۔ وہ ایک طرف اگر اپنے رب کی عبادت کرتے تھے اور ساتھ ہی دوسری طرف اپنی رسالت کے فریضہ کو بھی انجام دیتے تھے۔ یہ ہستیاں افراط وتفریط، اچھے بُرے، نظمی و بدنظمی، انضباط اور بے انضباطی سے مکمل آگاہی رکھتی تھیں اور لوگوں کو بھی ان سے آگاہ رکھتے تھے اور ہمیشہ خدا کی عطا کردہ عقل وفکر کی روشنی میں حرکت کرتے تھے اور اپنی ذمہ داریوں کو انجام دیتے تھے۔ کبھی بھی عمل کی کمیت ان کے پیش نظر نہیں رہی بلکہ ہمیشہ ان کی نظر اعمال کی کیفیت پہ رہتی ہے جن کا سر چشمہ خلوص نیت اور ان کا صحیح ہونا قرار پائی۔

﴿مَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيًّا إِلَّا عَاقِلًا حَتّٰى يَكُوْنَ عَقْلُهُ أَفْضَلَ مِنْ جَمِيْعِ جَهْدِ الْمُجْتَهِدِيْنَ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۷)

''خدا نے کوئی پیغمبرؐ ایسا مبعوث نہیں کیا مگر یہ کہ وہ عقلمند تھے عقل بھی اس قدر رکھتے تھے ان کی عقل عبادت کیلئے تمام کوشش کرنے والوں کی عقلوں سے برتر ہوتی تھی''۔

شائستہ ترین عقل

جن لوگوں نے اپنے دل کو مادیات اور شہوات کے سپرد کر رکھا ہے اور اپنے اعضاء و جوارح کو اپنی ہوا و ہوس کے اختیار میں دے رکھا ہے اگر وہ عبادات اور کوئی نیک عمل انجام بھی دیتے ہیں تو وہ بالکل سطحی انداز کا اور بے رُوح قسم کا ہوتا ہے صرف ظاہر کی حد تک ہوتا ہے۔ان کی عبادات گہری اور پائیدار نہیں ہوتی ہیں۔ایسے افراد کے اعمال میں خواہشات نفسانیہ کی جھلک دکھلائی دیتی ہے۔ان کے اعمال میں خدا کے حکم کی بجا آوری مشاہدہ نہیں کی جا سکتی۔ان افراد کے پاس ذات ربوبیت کے مقام کے لائق کوئی عمل نہیں ہوتا جسے اس کی بارگاہ میں پیش کر سکیں اور اسے بروز قیامت اپنی نجات کا ذریعہ بنا سکیں جبکہ قیامت کا دن ان کے اعمال کی جزاء کا دن ہے۔اگر ایسے لوگ نجات کے متمنی ہیں تو جب تک دنیا میں زندہ ہیں انہیں اپنی زندگی میں انقلاب لانا ہوگا، اپنے اعمال سے خواہشات نفسانیہ کو مٹا دیں، ان کی جگہ عقل کو قرار دیں۔

﴿كَيْفَ يَذْكُرُ عِنْدَ اللّٰهِ عَمَلُكَ وَ اَنْتَ قَدْ شَغَلْتَ قَلْبَكَ عَنْ اَمْرِ رَبِّكَ وَ اَطَعْتَ هَوَاكَ عَلٰى غَلَبَةِ عَقْلِكَ۔﴾ (اصول کافی، ج:۱،ص:۱۷)

''جب تم نے اپنے دل کو حکم خدا سے دُور رکھا ہے اور عقل کی سرکوبی کیلئے اپنی خواہشات نفسانیہ کی پیروی کی ہے پھر اب کیوں منتظر ہیں کہ تمہارا عمل تمہارے رب کے ہاں نتیجہ بخش اور شائستہ بن جائے گا''۔

عقل اور دین

دین اور عقل کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ موجود ہے۔چونکہ عقل انسان کی نیکی اور اچھائی کی طرف ہدایت کرتی ہے اور عقیدہ خدا شناسی مذہبی و دینی مدارک و مبانی عقائد اور ان پہ عمل کرنے سے بہترین نیکی اور اصلاح کیا ہو سکتی ہے۔بنابرایں آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دین وہ ہے جس کی طرف عقل رہنمائی کرتی ہے اور کوئی چیز عقل و منطق کی حریم سے خارج نہیں ہوتی اور دین وہ نایاب گوہر ہے جس کے بارے میں غور و فکر سے کام لیا گیا ہے جس کی جستجو اور کھوج میں بھی عقل سے کام لیا گیا ہے تب جا کر دین حاصل ہوا ہے، دین اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوا ہے۔یہ وہ امتیازات ہیں جو دین کی قدر و قیمت اور اہمیت کو بڑھاتے ہیں اور انسان کو تشویق دلاتے ہیں کہ وہ دین کا احترام کرے اور اس سے اس قدر محبت کرے کہ کبھی بھی اسے ہاتھ سے نہ جانے دے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام عقل اور دین کے مضبوط رشتے کو یوں بیان فرماتے ہیں:

﴿لَا دِيْنَ لِمَنْ لَا مُرُوَّةَ لَهُ وَلَا مُرُوَّءَ لِمَنْ لَا عَقْلَ لَهُ۔﴾ (اصول کافی، ج:۱،ص:۱۹)

''جس شخص میں مروت نہیں ہے اس کا دین بھی نہیں ہے اور جو عقل نہیں رکھتا وہ مروت بھی نہیں رکھتا''۔

طویل عمر

ہر معاشرے میں چند ایسے افراد ہوتے ہیں جو اپنے خاندان، اقرباء اور دوستوں سے بے انتہاء محبت کرتے ہیں اور ان سے نیکی و بھلائی کرتے ہیں جس کے نتیجے میں یہ افراد اپنے خاندان، اقرباء اور دوستوں کے ہاں ہر دلعزیز اور محبوب سمجھے جاتے ہیں۔بالکل اسی طرح کہ جس طرح یہ خود مدد اور کمک کے مستحق ہیں اور ضروری اور مناسب مواقع پہ اپنے خاندان والوں، دوستوں کی مہربانی، مدد اور ہمدردی سے بھی مستفید ہوتے ہیں۔اسی لئے ایسے افراد کو زندگی کے کسی بھی لمحے تنہائی کا احساس نہیں ہوتا۔چونکہ خداوند کریم ان کی پریشانیاں دُور کرنے کیلئے مخصوص افراد کو متعین فرما دیتے ہیں جس کے نتیجے میں یہ افراد بہت کم مشکلات اور پریشانیوں سے دوچار ہوتے ہیں اور یہ عمریں بھی طویل پاتے ہیں۔

اس بارے میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿مَنْ حَسُنَ بِرُّهُ بِاِخْوَانِهِ وَاَهْلِهِ مُدَّ فِيْ عُمْرِهِ۔﴾ (تحف العقول،ص:۳۸۸)

''جو بندہ اپنے خاندان، دوستوں اور مؤمن بھائیوں سے نیکی کرتا ہے اس کی عمر طولانی کر دی جاتی ہے''۔

عقل کے ساتھ عمل

خداوند کریم کے نزدیک واجبات کی قبولیت کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ ان کا ادراک حاصل کیا جائے۔بنابرایں جو عبادت فہم اور فکر کے بغیر

انجام پائے وہ عبادت نہیں ہے اور اس کا کوئی اجر و ثواب نہیں ہے۔ اسے انجام دینے والے نے ایک فضول زحمت اُٹھائی ہے۔ وہ سچے مؤمنین جو خلقت کے متعین مقصد کو پالیتے ہیں اور جان لیتے ہیں کہ دنیا میں لوگ شرعی ذمہ داریوں کو انجام دینے کے کیوں پابند ہیں جنھیں اُنہوں نے بہر حال انجام دینا ہے اور وہ اس طرح کہ انہیں انجام دینے کے نتیجے میں وہ خدا کے خصوصی لطف و کرم کے مستحق قرار پائیں گے۔ اگر وہ انہیں انجام دینے میں رُوگردانی کریں گے تو خدا کے غیض و غضب کا شکار ہو جائیں گے جبکہ وہ ان فرائض الٰہیہ جن کی انہیں ذمہ داری دی گئی ہے کے بارے میں خوب غور و فکر کرتے ہیں اور جانتے ہیں یہ واجبات مخلوق کیلئے کیا اثر رکھتے ہیں اور ان کا ہدف کیا ہے پس وہ سرچشمہ (ایمان) کو غور و فکر کے ذریعے محکم استوار کرتے ہیں تا کہ وہ اس کے مختلف عناوین میں غور و فکر کے ذریعے اپنے آپ کو مستحکم و پائیدار بنا سکیں۔

﴿مَا أَدَّى الْعَبْدُ فَرِيْضَةً مِنْ فَرَائِضِ اللّٰهِ حَتّٰى عَقَلَ عَنْهُ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۷)

''خدا کے بندے اپنے پروردگار کے فرائض میں سے کسی بھی فریضے کو انجام نہیں دیتے مگر وہ لوگ جو انجام دینے سے قبل ان کے بارے میں خوب غور و فکر اور تدبر کرتے ہیں''۔

غصہ

غصے کے تین مرحلے ہیں:۔

(۱) افراط۔ (۲) تفریط۔ (۳) اور اعتدال

افراط: کے مرحلے پہ وہ غصہ ہوتا ہے جب انسان کو آجاتا ہے تو انسان اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پاتا۔ عقل اور شریعت کے احکام کی پیروی سے بھی قاصر ہو جاتا ہے جو نہیں کہنا چاہئے وہ بھی کہہ دیتا، جو کام نہیں کرنا ہو وہ بھی کر گزرتا ہے۔ بزرگانِ دین نے جس غصہ سے منع فرمایا ہے وہ غصے کا یہی مرحلہ اور نکتہ ہے۔

تفریط: اس مرحلے پہ جب غصہ آتا ہے تو مندرجہ بالا خصوصیات سے یکسر خالی ہوتا ہے یا پھر اگر پائی بھی جائیں تو بہت کم مقدار میں پائی جاتی ہیں وہ بھی اس حد تک کہ عقل اور شریعت دونوں اسے ناجائز سمجھتی ہیں یعنی غصہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے اور یہ صورت بزدلی سے نمو پاتی ہے اور یہ صفت انتہائی ناپسندیدہ صفات میں سے ہے۔ اس صفت کی موجودگی انسان کو بے غیرت بنا دیتی ہے جس کے نتیجے میں اسے ظلم و ستم بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی از منکر کے معاملے میں بھی سُست روی کا شکار ہو جاتا ہے۔

اعتدال: یعنی یہ غصہ کی وہ حالت ہے کہ جب انسان برحق غصہ ہوتا ہے وہ عقل اور شریعت کی حدود کو ہرگز نہیں پھلانگتا۔ غصے کا اظہار بھی سنجیدگی اور قناعت سے کرتا ہے۔ اس حالت میں غصہ ایک پسندیدہ فعل شمار کیا گیا ہے بلکہ اسے ایک قسم کی شجاعت و بہادری کا نام دیا گیا ہے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام غصے کے پہلے مرحلے کی یوں توصیف بیان کرتے ہیں:

﴿اَلْغَضَبُ مِفْتَاحُ الشَّرِّ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۵)

''غصہ برائی کی چابی ہے''۔

جھوٹی بے نیازی

اگر حساب و کتاب کی بنیاد اور اساس کو سامنے رکھا جائے تو ہر بندے کو مادی ضروریات میں سے چند ایک چیزوں کی بہر حال ضرورت ہوتی ہے۔ ایک وہ گروہ ہے جو معقول حد تک مادی ضروریات پہ قانع ہو جاتا ہے اور ان پہ خوش و راضی ہو جاتا ہے اور دوسرا وہ گروہ ہے جس کی طلب زیادہ ہے اور جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اس پہ راضی نہیں ہے۔ پہلے گروہ کے پاس جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اسے کافی سمجھتے ہیں اور اسی پہ قناعت کرتے ہیں اور بے نیاز ہو جاتے ہیں اور خدا کا شکر یہ بجا لاتے ہیں۔ جبکہ دوسرا گروہ وہ ہے جو کبھی قانع نہیں ہوتا، حتیٰ کہ اگر پوری دُنیا کے مادی وسائل بھی انہیں دے دیئے جائیں وہ پھر بھی بے نیاز نہیں ہوتے ہیں۔

﴿إِنْ كَانَ يُغْنِيْكَ مَا يَكْفِيكَ فَأَدْنَىٰ مَا فِي الدُّنْيَا يَكْفِيْكَ وَإِنْ كَانَ لَا يُغْنِيْكَ مَا يَكْفِيكَ فَلَيْسَ شَيْءٌ مِنَ الدُّنْيَا يُغْنِيْكَ۔ ﴾
(تحف العقول،ص:۳۸۷)

''جو کچھ تیرے لئے کافی ہے اگر تو اُسی پر قانع ہو جائے تو اس دنیا میں بہت تھوڑی چیزیں ہیں جو تیرے لئے کافی ہوں گی اور جو کچھ تیرے لئے کافی ہے سے تو قانع نہیں ہے تو پھر اس جہاں کی کوئی چیز تجھے بے نیاز نہیں کر سکے گی''۔

بدزبانی

بعض افراد انتہائی خوش رفتار، مؤدب اور منکسر المزاج ہوتے ہیں۔ ہمیشہ دوسروں کے احترام کو مدنظر رکھتے ہیں اور بڑی خندہ پیشانی اور شیرین لب و لہجے کے ساتھ دوسروں کے ساتھ اظہار محبت والفت کرتے ہیں۔ ایسے افراد ہر دلعزیز اور لوگوں میں بڑی قدر اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کے متقابل افراد ان کو محترم اور بزرگ شمار کرتے ہیں جبکہ بعض افراد بالکل ان کے برعکس ہوتے ہیں اور وہ دوسروں کی اہمیت کے بالکل قائل نہیں ہوتے ہیں۔ لوگوں کے ساتھ ان کا رویہ بے احترامی اور اھانت پہ مبنی ہوتا ہے۔ ہمیشہ معیار سے گری ہوئی اور ناشائستہ گفتگو کرتے ہیں۔ لوگوں کو ان کی بدزبانی سے دُکھ اُٹھانے پڑتے ہیں اور تکالیف کو تحمل کرتے ہیں تبھی تو یہ افراد اپنی اس گھٹیا صفت (بدزبانی) کے سبب معاشرے میں کوئی مقام حاصل نہیں کر پاتے ہیں اور انہیں لوگوں کی نفرت کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ لوگ ہمیشہ ان سے گریزاں اور کھچے کھچے سے رہتے ہیں بلکہ لوگ تو ان کے ساتھ نشست و برخاست کے معاملے میں بھی اجتناب برتنے لگتے ہیں اور ان سے دُور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

امام ہفتم (موسیٰ کاظم علیہ السلام) ایک مختصر سے جملے میں یوں فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ شَرَّ عِبَادِ اللّٰهِ مَنْ تُكْرَهُ مُجَالَسَتُهُ لِفُحْشِهِ﴾ (تحف العقول،ص:۳۹۵)

''خدا کی مخلوق میں بدترین وہ ہے کہ لوگ جس کی بدزبانی اور فحش گفتگو کے سبب اس کے ساتھ بیٹھنے سے گریز کریں''۔

لوگوں سے فرار

انسان ایک اجتماعی مخلوق ہے جو لوگوں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرنا چاہتا ہے اور لوگوں سے محبت بھی کرتا ہے، تبھی تو بعض لوگوں کو اپنا دوست بنا لیتا ہے اور ان کی دوستی اور ہم نشینی سے کیف ولذت اُٹھاتا ہے۔ اسلام نے انسان کی اس خصلت پہ نہ فقط قدغن نہیں لگائی ہے بلکہ انسان کے اس اجتماعی پہلو کے مثبت نتائج کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی خوب حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ اسلام نے درس دیا ہے کہ انسان کو مؤدب، مہذب اور خوش اخلاق ہونا چاہئے۔ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ شفقت سے پیش آنا چاہئے، نماز جماعت میں شرکت کرنی چاہئے، مؤمنوں سے روابط رکھنے چاہئے، ضرورت مند اور محتاج افراد کی معنوی اور مالی امداد کرنی چاہئے، بیماروں کی عیادت کرنی چاہئے، تشیع جنازہ، نماز جنازہ میں شرکت کرنی چاہئے اور اس کی یاد میں منعقد ہونے والی محافل و مجالس میں شرکت کرنی چاہئے۔ بعض افراد کے ساتھ دوستی اور رفاقت کے رشتے استوار کرنے چاہئے، البتہ اسلام نے معاشرت کے آداب اور شرائط بھی ذکر کی ہیں مثلاً نیک لوگوں کے ساتھ معاشرت کرنی چاہئے، بُرے اور گنہگار افراد کی دوستی سے اجتناب کرنا چاہئے چونکہ ایسے افراد کی ہم نشینی اور دوستی میں تباہی و بربادی کے امکانات پائے جاتے ہیں، لہٰذا ان سے دُوری اختیار کرنی چاہئے۔

﴿إِيَّاكَ مُخَالَطَةَ النَّاسِ وَالْأُنْسَ بِهِمْ إِلَّا أَنْ تَجِدَ مِنْهُمْ عَاقِلاً وَمَأْمُوْناً فَأْنَسْ بِهِ وَاهْرَبْ مِنْ سَائِرِهِمْ كَهَرَبِكَ مِنَ السِّبَاعِ الضَّارِيَةِ﴾ (تحف العقول،ص:۳۹۸)

''لوگوں کے ساتھ معاشرت اور اُنس ومحبت کا رشتہ قائم کرنے سے اجتناب کرو مگر یہ کہ دوست ایک عقلمند اور قابل اطمینان شخص (جو تمہیں برائی کی طرف نہ لے جائے) اس سے اُنس قائم کرو اس کے علاوہ سب سے اجتناب کرو، جس طرح کہ ایک درندے نما جانور سے اجتناب کیا جاتا ہے''۔

مُنہ پہ تالا لگانا

بعض افراد جب منہ کھولتے ہیں اور اپنی زبان سے کام لینا شروع کرتے ہیں تو ان کی زبان سے گناہ برسنے لگتے ہیں، ہمیشہ جھوٹ بولتے ہیں، غیبت

کرتے ہیں، تہمت لگاتے ہیں، باطل گفتگو کرتے ہیں، چاپلوسی کرتے ہیں، حق کو ٹھکرا دیتے ہیں، سرِ بازار جھگڑتے ہیں، افواہیں پھیلاتے ہیں، اپنے ناروا رویّوں سے دوسروں کو تکالیف پہنچاتے ہیں، انہیں رنج پہنچاتے ہیں۔ان لوگوں کو جان لینا چاہئے کہ اُن کا کام خطرناک ہے۔اتنے جلد از جلد اپنے خلاف شرع اور بُرے افعال کو ختم کر دینا چاہئے۔اپنی زبانوں پر قفل ڈالتے ہوئے اپنے منہ بند رکھنے چاہئے اور انہیں خاموشی اختیار کرنی چاہئے تا کہ ان قریبی اور اردگرد بسنے والے افراد ان کی زبان کی درندگی سے محفوظ رہ سکیں اور ان کی زبان گناہوں سے محفوظ رہے ورنہ وہ خدا کے عذاب کے مستحق قرار پائیں گے۔البتہ بالکل خاموشی بھی ہر جگہ صحیح نہیں ہوتی بلکہ ہوسکتا ہے کہ بعض مقامات پہ خاموشی اختیار کرنا بھی گناہ ہو۔مثلاً جہاں انسان کو وعظ ونصیحت کرنی ہے وہاں خاموشی اختیار کرلے،حق پہ مبنی گفتگو نہ کرے اور خاموشی اختیار کرلے، اپنا یا کسی بھی حق پہ ہونے والے شخص کا دفاع نہ کرے اور خاموشی اختیار کرلے،امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کرے اور خاموشی اختیار کرلے اس قسم کے کئی دوسرے مواقع ہیں۔

بنابرایں انسان کو چاہئے کہ وہ ہر موقع پر پہلے غور وفکر کرے تا کہ خاموش رہنے اور بولنے کے لحاظ سے اس کی ذمہ داری واضح ہو سکے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کم بولنے کے فوائد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿قِلَّةُ الْمَنْطِقِ حُكْمٌ عَظِيمٌ فَعَلَيْكُمْ بِالصُّمْتِ فَإِنَّهُ وَعَةً حَسَنَةً وَقِلَّةُ وزرٍ خِفَّةٌ مِنَ الذُّنُوبِ﴾(تحف العقول،ص:۳۹۴)

''کم بولنا بہت بڑی حکمت ہے لہٰذا خاموشی اختیار کرو چونکہ خاموشی راحت بھری نیکی ہے،خدا کے عذاب کی کمی اور گناہوں کے کم ہونے کا سبب بنتی ہے''۔

اپنی طاقت سے بڑھ کر کام اپنے ذمہ لے لینا

بعض لوگ اپنے نام، منصب اور مقام سے استفادہ کرتے ہوئے ایسی ذمہ داریاں قبول کر لیتے ہیں کہ حقیقت میں وہ بالکل ان سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت نہیں رکھتے ہیں۔ان کے بجالانے کیلئے ضروری اہمیت اور توانائی بھی نہیں رکھتے ہیں جس کے سبب انہیں انجام تک نہیں پہنچا پاتے ہیں۔یہ افراد اس سارے عرصے میں قطع نظر اس کے کہ ان کا استحقاق بنتا تھا یا نہیں اس کام کا ذمہ اُٹھا لیتے ہیں۔اور اپنی ذات پہ لگنے والے اعتراضات کا ناحق دفاع کرنے لگتے ہیں۔اس بارے میں اُٹھنے والے اشکالات اور ہونے والے نقصانات کو بالکل مدنظر نہیں رکھتے ہیں یا پھر مشکل ترین حالات انہیں اپنی مرضی سے چھوڑ دیتے ہیں مگر ایک عقلمند اور مفکر قسم کا انسان ایسے نہیں کرتا۔جب تک اپنے اندر شائستگی اور اہلیت نہیں دیکھتا اس قسم کی ذمہ داری کو قبول ہی نہیں کرتا ہے اور اگر بفرض محال قبول کر بھی لے اور اپنی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے دوران اسے احساس ہو جائے کہ اس نے اپنے انتخاب میں غلطی کی تھی اور یہ کام تو میری پہنچ اور طاقت سے باہر ہے تو بغیر توقف کے فوراً مستعفی ہو جاتا ہے، مزید اس کام کے کرنے پہ ہرگز اصرار نہیں کرتا۔اجتماع کی مصلحت اور تقاضوں کو اپنی خواہشات پہ مقدم کر دیتا ہے۔اک طرف ہو جانے کو اپنی توہین و بے عزتی شمار نہیں کرتا اور جس کام کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں اس کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ الْعَاقِلَ اللَّبِيبَ مَنْ تَرَكَ مَا لَا طَاقَةَ لَهُ بِهِ﴾ (تحف العقول،ص:۳۹۹)

''عقلمند شخص وہ ہے جو اپنی طاقت سے بڑھ کر جو کام ہو اسے چھوڑ دیتا ہے''۔

کائنات

جب عقلمند انسان کی اس کائنات کے موجودات پہ نظر پڑتی ہے تو اس کے متعلق غور وفکر شروع کر دیتا ہے۔اس کائنات کے نظم وضبط اور حرکت کے بارے میں غور وفکر کرتا ہے کہ یقیناً اس کا کوئی خالق بھی ہے جس نے اسے خلق فرمایا ہے اور ایک خاص نظم وضبط کے تحت خلق فرمایا ہے۔اس خالق سے مراد اللہ ہے جس نے ساری کائنات کو خلق فرمایا ہے پھر اسے ایک نظام کے تحت قرار دیا ہے۔پس یہ کائنات انسان کیلئے لمحہ فکریہ بھی ہے اور مقام تفکر بھی، جس کے ذریعے انسان کو خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

اس بارے میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام قرآن کریم کی روشنی میں بیان فرماتے ہیں:

﴿فَقَدْ جَعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ دَلِيْلاً عَلٰى مَعْرِفَتِهٖ بِاَنَّ لَهُمْ مُدَبِّرًا۔﴾ (اصول کافی، ج:۱،ص:۱۳)

''خداوند کریم نے انسان کیلئے کائنات کو راہنما بنایا ہے تا کہ اس کے ذریعے وہ خالق کی پہچان کر سکے اور جان لینا چاہئے کہ اس میں انسان کیلئے مدبر موجود ہیں''۔

﴿فَقَالَ اللّٰهُ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرَاتٌ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰاتٌ لِقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ۔﴾ (سورۂ نحل، آیت:۱۲)

''خدا نے دن، رات، سورج، چاند اور ستاروں کو تمہارے (انسانوں) کے لئے مسخر کیا ہے، اس طرح کہ وہ سب خدا کے حکم کے مطابق اس کی پیروی کرتے ہیں، اس میں غور وفکر کرنے والے گروہ کیلئے نشانیاں موجود ہیں جو خدا کی (عظمت وبزرگی) کی نشانیوں میں سے ہیں''۔

بہرہ اور گونگا

بعض افراد جو چیز دیکھتے ہیں اس کے بارے میں غور وفکر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ کسی چیز کو بھی سطحی انداز میں نہیں لیتے ہیں۔ ان کی توجہ مفکرانہ ہوتی ہے اور نگاہ میں گہرائی ہوتی ہے، ان کی نظر میں تفکر پایا جاتا ہے۔ تبھی تو فوراً معلول سے علت تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور یہ تمام موجودت صانع واللہ کی طرف متوجہ کر رہے ہیں جبکہ بعض افراد مخلوق کے بارے میں بالکل بے اعتناء اور لاپرواہ ہوتے ہیں۔ کوئی بھی مخلوق ان کی فکر جاب نہیں کر پاتی اور کوئی مصنوعات انہیں اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی ہے۔ یہ لوگ خدا کی عطا کردہ فکری صلاحیت سے استفادہ نہیں کرتے ہیں تبھی تو ایسے افراد ملامت کے مستحق ٹھہرے ہیں۔

﴿ثُمَّ ذَمَّهُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ﴾ (تحف العقول، ص:۳۸۴ تا ۳۸۵) وَقَالَ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ﴾ (سورۂ انفال، آیت:۲۲)

''پھر خداوند کریم ایسے افراد کی جو تعقل نہیں کرتے ہیں کی مذمت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: خدا کے نزدیک بدترین حیوان اور رینگنے والے وہ ہیں جو بہرے (جو حق کی آواز نہیں سنتے ہیں) اور گونگے ہیں جو بے عقل اور بے فکر ہوتے ہیں''۔

ظالم کی خدمت کا کفارہ

ضروری ہے کہ صاحب ایمان افراد ہمیشہ عدالت کے متمنی اور عادل کے حامی و مددگار ہونے چاہئیں۔ جہاں بھی عدل سے متعلق گفتگو ہو رہی ہو وہاں جائیں اور جہاں بھی کوئی عادل حاکم علم کی شمع روشن کرے اس کی طرف بڑھنے لگیں اور اس کی مخلوق کی خدمت کے سلسلے میں مدد کریں تا کہ عدالت کو وسعت دی جا سکے اور معاشرے کے تمام طبقات اس سے بہرہ مند ہو سکیں۔ اگر کوئی مؤمن مرد کسی ظالم حکومت یا ظالم کے کسی نظام کا حصہ بن جائے اور ظالم کے ہاں کوئی عہدہ بھی پالے تو اس نے گناہ کیا ہے اور اس نے گویا ظالم کی مدد کی ہے۔ ہاں البتہ اگر ظلم وستم کے نظام کا حصہ بنتے وقت اس کی نیت یہ ہو کہ وہ اس نظام میں شامل ہو کر مؤمنوں اور مظلوموں کی امداد کرے گا اور انہیں ظلم وستم سے نجات دلانے کیلئے کوشاں رہے گا، ان کے رُکے ہوئے کام کروائے گا تو پھر کوئی اشکال نہیں ہے اور وہ گویا ظلم وستم کے سلسلے کا حصہ بننے کا کفارہ ادا کرے گا۔

امام موسیٰ کاظم ؑ نے علی بن یقطین کو جو آئمہ اطہار علیہم السلام سے عقیدت ومحبت رکھتا تھا اور مؤمن ومتقی فرد تھا اور ہارون رشید کے نظام کا حصہ بھی تھا کو مخاطب کر کے فرمایا:

﴿كَفَّارَةُ عَمَلِ السُّلْطَانِ الْاِحْسَانُ اِلَى الْاِخْوَانِ۔﴾ (تحف العقول، ص:۴۱۰)

''جابر وستم گر بادشاہ کے نظام کی خدمت کا کفارہ یہ ہے کہ اپنے مؤمن بھائیوں سے نیکی کرو''۔

تکبر اور خودسری

جب انسان علم یا علوم حاصل کر لے تو اس کا علم و دانش ہرگز اس کیلئے تکبر کا سبب نہیں بننا چاہئے۔ وہ علم ومعرفت جو اس کے نصیب اور حصہ میں آئی ہے کے ذریعے خود کو دوسروں سے ممتاز نہ سمجھے۔ ہمارے آئمہ اطہار علیہم السلام کے اصحاب جب ان مقدس ہستیوں کے حضور شرفیاب ہوتے، علم ومعرفت سیکھتے

اور کمال کے مدارج طے کرتے ہوئے مختلف مراتب تک پہنچتے تو یہ بزرگان ان کے سامنے اس نکتہ کا تذکرہ ضرور فرمایا کرتے تھے اور انہیں تکبر اور برتری سے منع فرمایا کرتے اور ساتھ ڈرایا بھی کرتے تھے۔

امام موسیٰ کاظم اپنے ایک صحابی ''ہشام'' کو جو ایک وفادار، سچے اور مخلص مؤمن تھے کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿إِيَّاكَ وَالْكِبْرَ عَلَىٰ أَوْلِيَائِي وَالْإِسْتِطَالَةَ بِعِلْمِكَ فَيَمْقُتَكَ اللّٰهُ فَلَا تَنْفَعَكَ بَعْدَ مَقْتِهِ دُنْيَاكَ وَلَا آخِرَتُكَ۔﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۸ تا ۳۹۷)

''میرے دوستوں کے ساتھ تکبر سے گریز کرنا، اپنے علم و دانش کا رُخ دُوسروں کی طرف نہ کرنا ورنہ اس طرح تو خداوند کریم تم سے دشمنی شروع کر دے گا، جب خدا دشمن بن جائے گا تو اس کے بعد دنیا و آخرت کی کوئی چیز تیرے لئے فائدہ مند نہیں رہے گی''۔

گفتارِ حق

حق و باطل کا ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور رہے گا۔ جب انسان یہ تشخیص کر لے کہ حق کہاں ہے اور باطل کہاں ہے تو پھر حق کا ساتھ دے اور باطل کو چھوڑ دے۔ خواہ حق سے تمسک اس کیلئے سودمند نہ بھی ہو۔ امام موسیٰ کاظمؑ نے اپنے ایک پیروکار کو یہ بات کچھ اس طرح سمجھائی ہے کہ اور اس کے متعلق بہت زیادہ تاکید بھی فرمائی ہے اور حق و باطل کے میدانوں کو باطل کے ظاہر سے دھوکہ کھانے والے افراد کی مثال دے کر تشریح فرمائی ہے تاکہ انسان کی ذمہ داری واضح ہو سکے اور اس کے بعد کوئی عذر و بہانہ باقی نہ بچے۔

﴿اَیْ فُلَانُ اِتَّقِ اللّٰهَ وَ قُلِ الْحَقَّ وَ اِنْ کَانَ فِیْهِ هَلَاكُكَ فَاِنَّ فِیْهِ نَجَاتَكَ اَیْ فُلَانُ اِتَّقِ اللّٰهَ وَدَعِ الْبَاطِلَ وَ اِنْ کَانَ فِیْهِ نَجَاتُكَ فَاِنَّ فِیْهِ هَلَاكَكَ۔﴾ (تحف العقول، ص:۴۰۸)

''اے فلاں! خدا سے ڈرو، ہمیشہ حق بیان کرو اگر چہ (ظاہری طور پر) اس میں تمہاری ہلاکت ہی کیوں نہ ہو، مسلّم ہے کہ تمہاری نجات حق میں ہے۔ اے فلاں! خدا سے ڈرو اور باطل کو چھوڑ دو اگر چہ (ظاہری طور پر) تمہاری نجات باطل میں ہی ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ باطل میں تمہاری ہلاکت ہے''۔

مؤمن کی گمشدہ چیز

جیسا کہ جب کسی انسان کی کوئی چیز کھو جائے تو وہ اسے تلاش کرنے لگتا ہے تاکہ اسے پا سکے۔ اسی طرح ایک مؤمن انسان کو بھی ہر حال میں اور ہر گام پہ علم و حکمت کی جستجو کرنی چاہئے۔ اور اسے حاصل کرنا چاہئے تاکہ اس کے پرتو میں اپنی دنیاوی زندگی اور آخرت کے مقام و منزلت کو روشن اور منور کر سکے۔ جبھی تو دیکھتے ہیں کہ علم کے تشنہ لوگ فرصت کے لمحات کو غنیمت سمجھتے ہوئے اپنے رہنماؤں اور علماء سے علم اور دین حکمت سیکھتے ہیں۔ ان ہستیوں سے کہ علم جن کے وجود سے وابستہ ہے، اگر وہ نہ ہوتے تو علم بھی نہ ہوتا۔

ساتویں تاجدارِ امامتؑ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ الْكَلِمَةَ مِنَ الْحِكْمَةِ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ فَعَلَيْكُمْ بِالْعِلْمِ قَبْلَ أَنْ يُرْفَعَ وَ رَفْعُهُ غَيْبَةُ عَالِمِكُمْ بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۴)

''حکمت آمیز گفتگو مؤمن کی گمشدہ (چیز) ہے، بنابرایں قبل اس کے کہ علم کا (وجود) ختم ہو جائے علم و دانش کو سیکھ لو، علم کے ختم ہونے کی مثال ایسے ہے جیسے علماء تمہارے درمیان سے اُٹھ (فوت) جاتے ہیں''۔

نیا گناہ، نئی مصیبت

اس میں کوئی شک نہیں کہ گناہ کے اپنے انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے مخصوص آثار ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ کبھی کبھار خداوند متعال گناہگاروں کو تنبیہ کرتے ہیں تاکہ وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائیں اور جان سکیں کہ انہیں خدا کی متعین کردہ حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے ورنہ انہیں سزا ملے گی۔

امام موسیٰ کاظمؑ اس موضوع کو ایک دلچسپ اور خوبصورت پیرائے میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿كُلَّمَا أَحْدَثَ النَّاسُ مِنَ الذُّنُوبِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَعْلَمُونَ أَحْدَثَ اللّٰهُ لَهُمْ مِنَ الْبَلَاءِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَعُدُّونَ﴾ (تحف العقول، ص:۴۱۰)

''جب لوگوں سے نئے سے نئے گناہ سرزد ہوتے ہیں اور اس کا ارتکاب کرتے ہیں تو خداوند متعال (ان کو تنبیہ کرنے اور سزا کے طور پر) انہیں ایک ناگہانی مصیبت سے دوچار کر دیتے ہیں''۔

بولنے والے

سب انسانوں کا انداز گفتگو ایک جیسا نہیں ہوتا۔ ایک بندہ اپنی گفتگو کا اجر پاتا ہے اور دوسروں کو فیض پہنچاتا ہے اور ایک بندہ اپنی گفتگو کے ذریعے گناہ کرتا ہے اور دوسروں کو تکلیف پہنچاتا ہے اور ایک بندہ وہ بھی ہے جو بالکل بولتا ہی نہیں ہے اور خاموشی وسکوت اختیار کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ گفتگو اور خاموشی دونوں ردعمل ایک جیسا نہیں ہوتا۔ ہر ایک کا اپنا اپنا نتیجہ ہوتا ہے جس کی بازگشت بہرحال بولنے والے کی طرف بھی ہوتی ہے اور خاموش رہنے والے کی طرف بھی۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے فرامین پہ توجہ کریں۔ آپ ردعمل اور نتیجہ بیان فرمارہے ہیں:

﴿اَلْمُتَكَلِّمُونَ ثَلَاثَةٌ فَرَابِحٌ وَسَالِمٌ وَشَاجِبٌ فَأَمَّا الرَّابِحُ فَالذَّاكِرُ وَأَمَّا السَّالِمُ فَالسَّاكِتُ وَأَمَّا الشَّاجِبُ فَالَّذِي يَخُوضُ فِي الْبَاطِلِ۔﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۴)

''بولنے والے افراد تین طرح کے ہوتے ہیں: وہ جو فائدہ اُٹھاتے ہیں، وہ جو سالم (محفوظ) رہتے ہیں، وہ جو ہلاک ہو جاتے ہیں، وہ لوگ جو فائدہ حاصل کرتے ہیں، وہ بھی جو ذکر خدا کرتے ہیں (چونکہ ہمیشہ خدا کی یاد میں رہتے ہیں، برائیوں سے بچتے ہیں اور اچھائیوں کی طرف بڑھتے ہیں) وہ لوگ جو محفوظ رہ جاتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو خاموشی اختیار کرتے ہیں اور وہ طبقہ جو ہلاکت سے دوچار ہوتا ہے وہ اپنی گفتگو اور موضوعات میں باطل اور ناپسندیدہ گفتگو کرتے ہیں''۔

سب سے زیادہ ضروری علوم

علوم بہت زیادہ ہیں تو دانش ومعرفت بھی بے شمار ہیں تبھی تو انسان حیران کھڑا ہے کہ اب وہ ان کے بارے میں کیا کرے؟ ان میں سے کس کا انتخاب کرے، وہ مادی علوم حاصل کرے یا معنوی علوم سے مستفید ہو؟ ہمارے آئمہ اطہار علیہم السلام کہ جن کے پیش نظر ہمیشہ انسان کی فلاں وخیر رہی ہے جب کسی شخص کو دیکھتے جو راہ رست کا طلبگار نظر آتا تو اس کی راہنمائی فرمادیا کرتے تھے اور اِسے تردد اور حیرانگی سے نجات دلاتے تھے۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام علم حاصل کرنے کے بارے تحصیل علم کے دوران کن علوم کو اولیت دی جائے کہ بارے میں فرماتے ہیں کہ ہمیشہ علم اخلاق اور تربیت کو اہمیت دی جائے۔

آپ کے فرمان سے اس علم کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے:

﴿اَلْزَمُ الْعِلْمِ لَكَ مَادَلَّكَ عَلٰى صَلَاحِ قَلْبِكَ وَأَظْهَرَ لَكَ فَسَادَهُ۔﴾ (بحارالانوار، ج:۷۰، ص:۳۳۳)

''سب سے ضروری علم تمہارے لئے وہ ہے جو تمہارے دل ودماغ کی پاکیزگی کی طرف راہنمائی کرے اور برائی کو تمہارے لئے آشکار کرے (تاکہ تم اپنے دل ودماغ) کو ان سے روک سکو، آلودگیوں اور کثافتوں سے پاک رکھ سکو اور متوقع تباہی سے بچ سکو''۔

خدا کا لطف وکرم

خدا کے لطف وکرم نے انسان کے پورے وجود کو گھیر رکھا ہے اور جو کچھ انسان کے پاس ہے کہ بارے میں غور وفکر کرے تو دیکھے گا کہ یہ سب کچھ خدا کے لطف وکرم کا نتیجہ ہے البتہ بعض افراد خدا کے خصوصی لطف وکرم اور انعام واکرام کے مستحق قرار پاتے ہیں مگر یہ لطف وکرم ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتا۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں: وہ خصوصی لطف وکرم عقل، علم اور مالی صورت میں ہوتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں:

﴿مَنْ أَكْرَمَهُ اللّٰهُ ثَلَاثٍ فَقَدْ لَطُفَ لَهُ عَقْلٌ يَكْفِيْهِ مَؤُوْنَةَ هَوَاهُ وَ عِلْمٌ يَكْفِيْهِ مَؤُوْنَةَ جَهْلِهِ وَ غِنًى يَكْفِيْهِ مَخَافَةَ الْفَقْرِ﴾ (تحف العقول،ص:۴۰۰)

''خدا جب کسی بندے کو تین چیزیں عطا کرتا ہے تو اس پہ خصوصی لطف ومہربانی کرتا ہے،ایسی عقل وسوچ جو اس کی خواہشاتِ نفسانیہ کا مقابلہ کر سکے، ایسا علم جو اس سے بے خبری کے نقصانات کو دُور کر سکے، وہ بے نیازی جو اس سے فقر کے خوف کو دُور کر سکے''۔

زبان کی لغزش

زبان سے محفوظ رہو اور بچو!چونکہ جو کچھ بھی انسان کے سر آتا ہے اسی زبان کے سبب آتا ہے۔اگر اچھا ہو تو صاحب زبان کو سعادت تک پہنچاتی ہے اور اگر بُرا ہو تو شقاوت سے دوچار کرتی ہے۔اصولاً بعض افراد کی زبان ان کے اختیار میں نہیں ہوتی ان کی کوشش ہوتی ہے کہ دوسروں کے بارے میں ہمیشہ بُرے اور ناشائستہ الفاظ ہی ادا کریں، جیسا کہ بعض افراد کی مجبوری ہوتی ہے کہ وہ چُپ اور خاموش نہیں رہ سکتے ہیں وہ ہمیشہ لوگوں کے بارے میں کوئی نہ کوئی باتیں گھڑنے کی فکر میں رہتے ہیں جبکہ عقلمند شخص کی زبان اس کے اپنے قبضے میں ہوتی ہے وہ اسے ہرگز آزاد نہیں چھوڑتا۔

امام موسیٰ علیہ السلام ابن جعفر علیہ السلام اس بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿هَلْ يَكُبُّ النَّاسَ عَلٰى مَنَاخِرِهِمْ فِي النَّارِ اِلاَّ حَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِمْ﴾ (تحف العقول،ص:۳۹۵)

''کیا کوئی ایسی چیز ہے جو زبان سے لائی ہوئی نہ ہو اور لوگوں کو مُنہ کے بل آگ میں ڈالنے کا سبب بن رہی ہو؟''۔

لوگوں کی چار قسمیں ہیں

﴿يَا هُشَامُ اِحْذَرْ هٰذِهِ الدُّنْيَا وَاحْذَرْ اَهْلَهَا فَاِنَّ النَّاسَ فِيْهَا عَلٰى اَرْبَعَةِ اَصْنَافٍ رَجُلٌ مُتَرَدِّیْ مُعَانِقٌ لِهَوَاهُ وَمُتَعَلِّمٌ مُقْرِئٌ كُلَّمَا ازْدَادَ عِلْمًا ازْدَادَ كِبْرًا يَسْتَعْلِيْ بِقَرَآئِتِهِ وَ عِلْمِهِ عَلٰى مَنْ هُوَ دُوْنَهُ وَ عَابِدٌ جَاهِلٌ يَسْتَصْغِرُ مَنْ هُوَ دُوْنَهُ فِيْ عِبَادَتِهِ يُحِبُّ اَنْ يُعَظَّمَ وَ يُوَقَّرُ وَ ذِیْ بَصِيْرَةٍ عَالِمٍ عَارِفٍ لِطَرِيْقِ الْحَقِّ يُحِبُّ الْقِيَامَ بِهِ فَهُوَ عَاجِزٌ اَوْ مَغْلُوْبٌ وَ لَا يَقْدِرُ عَلٰى الْقِيَامِ بِمَا يَعْرِفُهُ فَهُوَ مَحْزُوْنٌ مَغْمُوْمٌ بِذٰلِكَ فَهُوَ اَمْثَلُ اَهْلِ زَمَانِهِ وَ اَوْجَهُهُمْ عَقْلاً﴾ (تحف العقول،ص:۴۰)

''اے ہشام! دُنیا اور دنیا والوں سے دُوری اختیار کرو چونکہ دنیا میں لوگوں کی چار قسمیں ہیں:۔

(۱) وہ لوگ جو ہلاکت وتباہی سے دوچار ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ اپنی ہوا وہوس میں دھنسے اور پھنسے رہتے ہیں۔

(۲) وہ لوگ ہیں جو علم ودانش اور قرآنی علوم حاصل کرنے میں مصروف رہتے ہیں، جس کا علم زیادہ ہوگا اس کا تکبر بھی اسی قدر بڑھ جائے گا۔وہ قرأتِ قرآن اور اپنے علم کے ذریعے اپنے سے کم علم والوں پہ فخر ومباہات کرتے رہتے ہیں۔

(۳) وہ نادان عبادت گزار کہ جو لوگ ان کے پائے عبادت کو نہیں پہنچ سکتے ان کو اپنے سے کم سمجھنے لگتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ ان کی تعظیم وتکریم کریں۔

(۴) وہ لوگ جو علم ودانش رکھتے ہیں وہ حق کے راستے کو پہچانتے ہیں وہ پسند کرتے ہیں کہ قیام کریں تاکہ حق کو قائم کرسکیں لیکن وہ یا نہیں کر سکتے اور اگر کرسکتے ہیں تو (مخالفین) ان پر ایسے مسلط ہیں کہ وہ جس طرح چاہتے ہیں قیام کریں، نہیں کر سکتے۔

دوستی کی سرحد

بعض افراد اپنے معاملات میں افراط سے کام لیتے ہیں مثلاً جب انہیں کسی سے اختلاف ہوجائے اور یہ اختلاف اگر کسی سے جھگڑنے کا سبب بنے اور طرفین کے درمیان نازیبا کلمات کے تبادلے کا سبب بنے تو یہ بجائے اس کے اس کدورت واختلاف کو دُور کرتے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھانے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔بلکہ بعض اوقات تو معاملے کو اس حد تک بڑھا دیتے ہیں کہ ان کے درمیان پایا جانے والا دوستی وبرادری کا تعلق ختم ہوکر رہ جاتا ہے اور وہ شرم وحیاء جو ان کے درمیان ہونے والی بیہودہ گفتگو اور گالم گلوچ کو روکتا وہ ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

امام ہفتم علیہ السلام اس عمل کو حیاء کیلئے سنگین خطرہ قرار دیتے ہوئے لوگوں کو اس سے منع فرماتے ہیں:

﴿لَا تُذْهِبِ الْحِشْمَةَ بَيْنَكَ وَ بَيْنَ أَخِيكَ وَ أَبْقِ مِنْهَا فَإِنَّ ذَهَابَهَا ذَهَابُ الْحَيَاءِ۔ ﴾ (تحف العقول،ص:۴۰۹)

''اپنے اور اپنے دوست کے درمیان موجود شرم و حیاء کو ختم نہ کرو بلکہ اسے باقی رکھو چونکہ اس کے ختم ہو جانے کے سبب حیاء ختم ہو جاتی ہے''۔

گناہ اور ذمہ داریوں کا انجام

کتنی حسین و زیباء ہیں وہ نصیحتیں اور اوامر و نواہی جو ہمارے آئمہ معصومین علیہم السلام کی طرف سے ہیں۔ جب وہ کوئی بات ہمیں سمجھانا چاہتے تھے تو اس طرح واضح انداز میں بیان فرماتے تھے کہ کسی قسم کا شک اور ابہام باقی نہیں رہتا تھا اور وعظ و نصیحت کیلئے اتنا دلنشین انداز اپناتے تھے کہ مخاطب کا دل فوراً قانع اور تسلیم ہو جاتا اور وہ مواعظ اس کے دل پہ گہرے اثرات چھوڑتے اور اسے یقین ہو جاتا کہ امام علیہ السلام اسے خالص حقیقت سمجھانا چاہ رہے ہیں اور امام علیہ السلام نے اس کیلئے جو ذمہ داری معین فرمائی ہے وہ قطعی اور یقینی ہے اس کیلئے اس پر عمل کرنا لازمی و ضروری ہے۔ آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ امام ہفتم علیہ السلام اپنے ایک فرزند کو خدا کی اطاعت اور معصیت کے ضروری و لازمی ہونے کی کیفیت کو کس انداز میں بیان فرما رہے ہیں:

﴿إِيَّاكَ أَنْ يَرَاكَ اللّٰهُ فِي مَعْصِيَةٍ نَهَاكَ عَنْهَا وَ إِيَّاكَ أَنْ يَفْقِدَكَ اللّٰهُ عِنْدَ طَاعَةٍ أَمَرَكَ بِهَا۔ ﴾ (تحف العقول،ص:۴۰۹)

''ایسا نہ ہو کہ خداوند متعال تمہیں اس گناہ کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھ لے جس سے اس نے نہی فرما رکھی ہے اور خیال رکھنا ایسا نہ ہو کہ جس ذمہ داری اور فریضہ کی انجام دہی کا تمہیں حکم دے رکھا انجام دیتے وقت تمہیں نہ دیکھے!''۔

عقلمند سے مشورہ

اپنی زندگی کے امور میں دوسروں سے مشورہ کرنا ایک پسندیدہ عمل ہے اور اسلامی اور اخلاقی احکام میں شمار ہوتا ہے۔ ہاں البتہ جس شخص سے مشورہ کرنا چاہتا ہے اس کی چند شرائط ہیں: پہلی شرط یہ ہے کہ وہ عقلمند ہوتا کہ عاقلانہ رائے دے سکے اور انسان کی صحیح سمت کی طرف رہنمائی کرے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ خیر خواہ اور ہمدرد قسم کا انسان ہو، وہ مشورہ کرنے والے کو پسند بھی کرتا ہے اس کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ بھی رکھتا ہوتا کہ جس چیز میں اس کی بہتری اور بھلائی ہے کا اسے مشورہ دے سکے۔ اگر کسی انسان کو ایسا مہربان اور عقلمند دوست مل جائے تو اس کے خیالات و نظریات کو غنیمت شمار کرتے ہوئے ان پہ عمل کرے۔

﴿وَ مُشَاوِرَةُ الْعَاقِلِ النَّاصِحِ يُمْنٌ وَ بَرَكَةٌ وَ رُشْدٌ وَ تَوْفِيقٌ مِنَ اللّٰهِ فَإِذَا أَشَارَ عَلَيْكَ الْعَاقِلُ النَّاصِحُ فَإِيَّاكَ وَ الْخِلَافَ فَإِنَّ فِي ذٰلِكَ الْعَطَبَ۔ ﴾ (تحف العقول،ص:۳۹۸)

''ایک عقلمند اور خیر خواہ قسم کے شخص سے مشورہ سعادت، برکت، کامیابی اور خدا کی عطا کردہ توفیقات میں سے ایک ہے، جب بھی کوئی خیر خواہ قسم کا عقلمند انسان مشورے کے دوران تجھے راہِ راست کا مشورہ دے تو اس پہ عمل کرو اور اگر تم نے اس کی مخالفت کی تو ہلاک ہو جاؤ گے''۔

مصیبت

قرآن کریم، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام کے ارشادات و ہدایات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ خداوند کریم کبھی کبھی اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈالتے ہیں اور انہیں کسی مصیبت میں گرفتار کر دیتے ہیں پس ایسے افراد جو آزمائش کا شکار ہوں ان کا فریضہ اور ذمہ داری یہ ہے کہ وہ صبر سے کام لیں اور پیش آنے والے حالات پہ صبر و شکر کا اظہار کریں۔ خدا کی مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں چونکہ یہی صبر و رضا انسان کے محکم ایمان کی نشانی ہیں اور صابروں کیلئے عظیم جزاء اور بہت بڑا اجر رکھا گیا ہے۔ خداوند کریم ان پہ اپنی برکات اور رحمتیں نازل فرماتے ہیں جبکہ بعض بیچارے قسم کے بے صبرے افراد مصائب کے مقابلے میں صبر کی حدود پھلانگ جاتے ہیں اور تحمل نہیں کر پاتے ہیں اور اس عظیم ثواب کو جو ان کا منتظر رہتا ہے کو ضائع کر دیتے ہیں۔

امام ہفتم علیہ السلام اس حقیقت کو ایک چھوٹے سے فصیح و بلیغ جملے میں یوں بیان فرماتے ہیں:

﴿الْمُصِيبَةُ لِلصَّابِرِ وَاحِدَةٌ وَ لِلْجَازِعِ اثْنَانِ۔ ﴾ (تحف العقول،ص:۴۱۴)

''صبر و شکر کرنے والے شخص کیلئے ایک مصیبت ہوتی ہے اور بے صبرے انسان کیلئے دو مصیبتیں ہوتی ہیں (ایک وہ مصیبت جس نے آکر اسے پریشان

کر دیا ہے، دوسرا اس اجر وثواب کا ختم ہونا بھی ایک مصیبت ہے جو صرف اس کے بے صبرے پن کی وجہ سے آتی ہے)''۔

پہچان کا معیار

اگر کوئی انسان اپنے نفس کے اندر کمال پیدا کرنا چاہتا ہے اور اپنے آپ کو خداوند کریم کے ہاں بلند و ارفع مقام پہ فائز دیکھنا چاہتا ہے یعنی ایک مقام کا خواہاں ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنے رب کی اطاعت کرے، اس طرح وہ اپنے مقصد تک پہنچ جائے گا۔ البتہ اطاعت کیلئے امر و نہی کو پہچاننا ضروری ہے اور اوامر و نواہی کی پہچان تب ممکن ہوگی کہ جب عقل کے ذریعے ان کا ادراک کیا جائے گا۔ اس خصوصیت کا علم صرف عالم ربانی کے ہاں پایا جائے گا۔ ایسے علم کی پہچان صرف ایسے علماء کے پاس ہی ممکن ہے تا کہ مندرجہ بالا مواقع میں ان سے استفادہ کیا جا سکے۔ یہ سب کچھ عقل کے ذریعے ہی ممکن ہوگا۔ خلاصہ: تمام اچھائیوں کے حصول کا مرکز و محور عقل ہے۔

﴿نُصِبَ الْحَقُّ لِطَاعَةِ اللّٰهِ وَ لَا نَجَاةَ اِلَّا بِالطَّاعَةِ وَ الطَّاعَةُ بِالْعِلْمِ وَ الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ وَ التَّعَلُّمُ بِالْعَقْلِ يُعْتَقَدُ وَ لَا عِلْمَ اِلَّا مِنْ عَالِمٍ رَبَّانِيٍّ وَ مَعْرِفَةُ الْعِلْمِ بِالْعَقْلِ﴾ (اصول کافی، ج:۱،ص:۱۷)

''حق کو نصب کیا گیا ہے تا کہ لوگ اپنے رب کی اطاعت کر سکیں اور نجات صرف اطاعت خدا کے ذریعے ہی ممکن ہے اور اطاعت علم کے ذریعے جب کہ علم عقل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور علم صرف عالم ربانی کے پاس ہوتا ہے اور اس علم کی پہچان (عالم ربانی کے پاس) صرف عقل کے ذریعے ہی ممکن ہے''۔

مہربانی

بعض لوگ دُوسروں کے بارے میں انتہائی لاپرواہ قسم کے ہوتے ہیں، ان کے بارے میں کسی قسم کی مہربانی اور محبت کا اظہار نہیں کرتے ہیں، اپنے آپ کو لوگوں کی دوستی کا محتاج نہیں سمجھتے ہیں۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو اس نے باقاعدہ حکم دیا ہے اور اس سلسلے میں عقل میں بھی ہماری راہنمائی کرتا ہے کہ انسان لوگوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آئے۔ ان کیلئے عزت و تکریم اور ان کے مقام کا قائل ہو، ان کے ساتھ نیکی کرے اور ان سے محبت کرتا ہو۔ البتہ ایسے انسانوں سے محبت و اخوت کا رشتہ قائم کرے جن میں انسانیت، تقویٰ، ایمان اور بہترین اخلاق کے مالک ہوں، نہ کہ ایسے افراد سے دوستی کرے جو انسانیت اور اخلاق سے کوسوں دُور ہوں، جن کی نظر میں دشمنی اور مہربانی کے درمیان کوئی فرق ہی نہ ہو اور وہ دوسروں کیلئے کسی قدر و قیمت اور مہربانی کے قائل ہی نہ ہو۔ البتہ ان کے درمیان قائم دوستی کے رشتے کا مقصد صرف انہیں ہدایت کرنا ہو۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اس مہربانی کو جو اسلامی اخلاق کی روشنی میں قائم ہو کو عقل کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور اسے آدھی عقل شمار کرتے ہیں:

﴿اَلتَّوَدُّدُ اِلَى النَّاسِ نِصْفُ الْعَقْلِ۔﴾ (اصول کافی، ج:۲،ص:۶۴۳)

''لوگوں کے ساتھ مہربانی اور دوستی آدھی عقل ہے''۔

میانہ روی

جو لوگ دولت مند ہو کر بھی میانہ روی اور اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں اور قناعت کو خود سے جدا نہیں ہونے دیتے ہیں۔ ان کی خداداد نعمتیں محفوظ اور پائیدار ہیں۔ چونکہ اقتصادی طور پر مضبوط اور قانع افراد کی نظریں ہمیشہ ذات خدا پہ مرکوز رہتی ہیں، وہ تمام نعمتوں کو خدا کی طرف سے سمجھتے ہیں اور ان کا شکریہ بھی بجا لاتے ہیں، البتہ وہ افراد جو ان نعمات کی فراوانی کی صورت میں بے حساب خرچ کرتے ہیں وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کو بھول بیٹھے ہیں اور اس کی نعمتوں کے بدلے شکریہ ادا نہیں کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جو بندہ خدا کی نعمتوں کا شکریہ نہیں بجا لاتا اور اسراف کرتا ہے اس کیلئے نعمتیں ہرگز ابدی و دائمی نہیں رہتی ہیں۔

﴿مَنِ اقْتَصَدَ وَقَنِعَ بَقِيَتْ عَلَيْهِ النِّعْمَةُ وَ مَنْ بَذَّرَ اَسْرَفَ زَالَتْ عَنْهُ النِّعْمَةُ﴾ (تحف العقول، ص:۴۰۳)

''جو بندہ میانہ روی اور قناعت کو اختیار کرتا ہے اس کی نعمات باقی رہتی ہیں اور جو بندہ اسراف کرتا ہے اس سے نعمات سلب کر لی جاتی ہیں''۔

ناشکری

علم کلام کے علماء کے بقول: منعم (خدا) کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے، اور شکر یہ وہ فریضہ ہے کہ اگر انسان اس کی بجا آوری میں سستی اور غفلت برتے تو گویا اس نے ایسے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کی ہے جن کی عدم ادائیگی پہ باقاعدہ عذاب نازل ہوتا ہے۔ بنابرایں انسان کو اپنی زندگی کے ہر لحہ موجود میں مسئلہ شکر کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ ہمیشہ خود کو خدا کی نعمتوں میں غرق اور خود کو ان کے شکر کیلئے تیار رکھنا چاہئے تا کہ وہ زبان اور عمل سے شکر کو بجا لا سکے۔ یوں گویا اس نے عظیم ترین فریضہ کو ادا کر دیا ہے۔

امام ہفتم ایک دلچسپ اور خوبصورت عبارت میں قابل ادراک تشبیہ کے ذریعے اس مطلب کو یوں فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ كُلَّ نِعْمَةٍ عَجَزْتَ عَنْ شُكْرِهَا بِمَنْزِلَةِ سَيِّئَةٍ تُوَاخِذُ بِهَا﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۴)

''ہر وہ نعمت جس کا شکر بجا لانے میں تم عاجز تھے یہ ایسے گناہ کی مانند ہے جس کا عذاب تم دیکھو گے''۔

لالچ کا نتیجہ

لالچ بُری بلا ہے۔ انسان کو گھٹیا اور بے مروت بنا دیتی ہے۔ اس کے علم و دانش کا اثر بھی ختم کر دیتی ہے اور اس کی عزت و آبرو کو ختم کر دیتی ہے۔ خلاصہ: لالچ انسان سے اس کی تمام خوبیاں چھین لیتی ہے اور اسے ایک ایسا انسان بنا دیتی ہے جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی اور وہ انسانی قدروں کو کھو دیتا ہے۔

امام ہفتم اپنے اس فرمان میں لالچ کے نقصانات کو بڑے دلچسپ انداز اور بڑی صراحت کے ساتھ بیان فرما رہے ہیں:

﴿إِيَّاكَ وَالطَّمَعَ وَعَلَيْكَ بِالْيَأْسِ مِمَّا فِي أَيْدِي النَّاسِ وَأَمِتِ الطَّمَعَ مِنَ الْمَخْلُوقِينَ فَإِنَّ الطَّمَعَ مِفْتَاحٌ لِلذُّلِّ وَاخْتِلَاسِ الْعَقْلِ وَاخْلَاقِ الْمُرُوَّاتِ وَتَدْنِيسِ الْعِرْضِ وَالذَّهَابِ بِالْعِلْمِ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۹)

''لالچ سے بچو! جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے دل مت لگاؤ، اپنے اندر سے لوگوں کے مال کا لالچ ختم کرو چونکہ لالچ ذلت و خواری کی کلید (کنجی) ہے اور عقل کو زائل کرنے والے عوامل کی کنجی ہے، اس سے مردانگی پہ حرف آتا ہے اور عزت و دانش ختم ہو جاتی ہے''۔

عقلمند کی نشانی

ہر چیز کی چند علامات ہوتی ہیں، ہر صفت کے آثار انسان میں پائے جاتے ہیں اور ایمان کی بھی انسان کے اندر علامات پائی جاتی ہیں اور اس طرح بے ایمانی کی علامات بھی ہوتی ہیں جو عقلمند انسان کے رفتار، گفتار اور کردار سے عیاں ہوتی ہیں کہ وہ عقلمند بھی ہے اور متین بھی اور وہ شخص جس کا عقل سے کسی بھی قسم کا واسطہ نہیں ہوتا وہ بھی اپنی گفتگو اور عمل سے پہچانا جاتا ہے۔

امام ہفتم علیہ السلام ایک مختصر سے جملے میں معاشرے کو بہت بڑا مفہوم سمجھانا چاہ رہے ہیں اور فرماتے ہیں:

''عقلمند کی نشانی یہ ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا، اگر چہ وہ ہوا و ہوس کے ہاتھوں مجبور ہی کیوں نہ ہو۔ چونکہ عقل مند ہمیشہ اپنے عقل کے حکم کے مطابق عمل کرتا ہے وہ ہوا و ہوس کی پیروی نہیں کرتا اور عقل جھوٹ بولنے والے کو گھٹیا اور ناپسندیدہ عمل شمار کرتی ہے''۔

﴿إِنَّ الْعَاقِلَ لَا يَكْذِبُ وَإِنْ كَانَ فِيهِ هَوَاهُ﴾ (اصول کافی، ج:۱، ص:۱۹)

''عقلمند کبھی جھوٹ نہیں بولتا اگر چہ (یہ کام) اس کی ہوا و ہوس کی خواہش کے مطابق ہی کیوں نہ ہو''۔

سب سے قیمتی نعمت

ہر انسان کا آخری مقصد اور خواہش یہی ہوتی ہے کہ اسے دنیا اور آخرت کی سعادت نصیب ہو جائے۔ ہم گذشتہ صفحات میں عرض کر چکے ہیں جس کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے دنیا و آخرت کی سعادتیں صرف عقل سے ہی ممکن ہیں، چونکہ عقلاء اپنی عقل کی روشنی میں دنیا میں بہترین زندگی بسر کرتے ہیں اور

ساتھ ہی اپنی آخرت کے بارے میں بھی فکر مند نظر آتے ہیں اور دنیا میں اپنی آخرت کیلئے توشہ تیار کر لیتے ہیں۔ پس عقل سب سے اعلیٰ ترین نعمت ہے اور خدا کے عطا کردہ تحائف میں ایک بہترین تحفہ ہے۔

اس بات کو امام ہفتم علیہ السلام ہمیشہ کی طرح ایک فصیح و بلیغ جملے میں یوں بیان فرما رہے ہیں:

﴿مَا قُسِّمَ بَیْنَ الْعِبَادِ اَفْضَلُ مِنَ الْعَقْلِ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۷)

''خدا کے بندوں کے درمیان عقل سے زیادہ بہتر کوئی چیز تقسیم نہیں ہوئی''۔

نماز

اصولاً عبادت انسان کو خدا کے قریب کرتی ہے اور خدا کے ہاں انسان کے مقام کو بلند کرتی ہے۔ البتہ عبادت سے مراد وہ عبادت ہے جو تمام شرائط کے ساتھ انجام دی جائے۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو نماز بڑے گہرے نقوش اور اثرات رکھتی ہے، چونکہ اس عظیم عبادت کی انجام دہی کیلئے ضروری ہے کہ انسان روحانی اور جسمانی لحاظ سے پاک ہو۔ کثافتوں سے منزّہ ہوتا کہ یہ نورانی اور پاک کنندہ عبادت بارگاہ ایزدی میں سند قبولیت پا سکے اور انسان اس کے ذریعے خدا کا قرب پا سکے اور بلند و بالا معنوی مراتب کو کسب کر سکے۔

امام ہفتم علیہ السلام اس بارے میں ایک مختصر مگر بہت ہی حسین جملے میں مستحبی نمازوں کی خصوصیات اور فضیلت بیان فرماتے ہیں:

﴿صَلَاۃُ النَّوَافِلِ قُرْبَانٌ اِلَی اللّٰہِ لِکُلِّ مُؤْمِنٍ۔﴾ (تحف العقول، ص:۴۰۳)

''نوافل نمازیں ہر مؤمن کیلئے خدا کے قریب ہونے کا وسیلہ منتخب ہیں''۔

نیکیاں

بعض اخلاقی احکام ایسے ہوتے ہیں جن کا تعلق صرف مخصوص افراد جیسے مؤمنین وغیرہ کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ تمام انسانوں کیلئے ہوتے ہیں کہ وہ سب ان پر عمل کریں مثلاً اگر کوئی انسان کسی کے ساتھ نیکی کرتا ہے تو دوسرے بندوں کو بھی چاہئے کہ وہ اس نیکی کا بدلہ چکائیں۔ اب نیکی کرنے والا یا جس کے ساتھ نیکی ہوگی بے شک وہ مؤمن ہو یا بے ایمان نیک ہو یا بد کوئی فرق نہیں پڑتا۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اس حقیقت کو ایک آیت کی تفسیر کی صورت میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿قَوْلُ اللّٰہِ:

ھَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۔﴾ (سورۂ رحمٰن، آیت:۶۰)

''خداوند کریم کا قول ہے:

کیا نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا بھی ہوتا ہے؟''۔

﴿جَرَتْ فِی الْمُؤْمِنِ وَالْکَافِرِ وَالْبَرِّ وَالْفَاجِرِ مَنْ صُنِعَ اِلَیْہِ مَعْرُوْفٌ فَعَلَیْہِ اَنْ یُکَافِیَ بِہٖ۔﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۵)

''مؤمن، کافر، نیک اور بدکار سب کے بارے میں یہ حکم جاری ہے جو بندہ بھی ان کے ساتھ نیکی کرے ضروری ہے کہ یہ بھی اس نیکی کا بدلہ اُتاریں''۔

نیکی اور ظلم

ہر نیک کام کا خداوند کریم کے ہاں اجر و ثواب موجود ہے جو اس کے انجام دینے والے کو عطا کیا جائے گا اور ہر بُرے کام کی سزا اور عذاب بھی موجود ہے جو انجام دینے والے کو دیا جائے گا، البتہ ثواب اور عذاب بندوں تک کبھی جلدی پہنچ جاتے ہے اور کبھی تھوڑی دیر کے بعد پہنچتے ہیں۔ نیکی کرنے والے انسان کے پاس اس کا ثواب جلدی پہنچ جاتا اور اسی طرح گھٹیا کام ظلم وغیرہ کا عذاب بھی ظالم اور اسے انجام دینے والے کے پاس جلد پہنچ جاتا ہے۔ اس حقیقت کو امام موسیٰ علیہ السلام ابن جعفر علیہ السلام بیان فرماتے ہیں تاکہ لوگ نیکی کے کاموں کی طرف قدم بڑھائیں، ظلم سے اجتناب کریں اور جان لیں کہ بعض اچھے اور بُرے

کاموں کا ثواب اور عذاب بہت جلدی پہنچ جاتا ہے:

﴿إِنَّ أَسْرَعَ الْخَيْرِ ثَوَابًا الْبِرُّ وَأَسْرَعَ الشَّرِّ عُقُوبَةً الْبَغْيُ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۵)

"ہر کار خیر سے لوگوں کے ساتھ نیکی کا بدلہ اور ہر بدی سے لوگوں کے ساتھ ظلم کا بدلہ بہت جلد ملتا ہے"۔

عقل کا وسیلہ

ہر چیز اور ہر کام اپنے انجام تک پہنچنے کیلئے وسیلے کا محتاج ہوتا ہے۔ عقلمند شخص اپنی عقل سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے امور کو عقل کے حکم کے مطابق انجام دیتا ہے، یعنی اسے ایک وسیلے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور وہ وسیلہ عاجزی ہے۔ انسان عاجزی کے وسیلے سے اپنی عقل سے استفادہ کر سکتا ہے اور یوں وہ اپنے مقصد و ہدف کو با آسانی پالیتا ہے اور پھر اپنے کاموں کو نپٹانے کی توفیق حاصل کرتا ہے۔ اور اگر عقلمند شخص تکبر سے کام لے، عاجزی اور انکساری کو چھوڑ دے تو وہ بہت سارے امور میں عقل کو اپنے پاؤں تلے روند کر اپنی خواہشات کی اتباع کرنے لگے گا۔ یوں عقل اپنا کام نہیں کر پائے گا اور اپنا فریضہ انجام نہیں دے سکے گا اور عقلمند کو کبھی بھی اسکے ہدف تک نہیں پہنچا پائے گا۔

امام موسیٰ علیہ السلام بن جعفر علیہ السلام اس اہم مسئلے کو ظرافت بھرے جملے میں بیان فرما رہے ہیں:

﴿لِكُلِّ شَيْءٍ مَطِيَّةٌ وَمَطِيَّةُ الْعَقْلِ التَّوَاضُعُ وَكَفٰى بِكَ جَهْلًا أَنْ تَرْكَبَ مَا نُهِيتَ عَنْهُ۔﴾ (اصول کافی، ج:۱، ص:۱۶)

"ہر چیز کیلئے ایک وسیلہ ہوتا ہے اور عقل کا وسیلہ عاجزی و انکساری ہے۔ تمہاری نادانی اور بیوقوفی کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ تو وہ کام انجام دے جس سے تمہیں منع کیا گیا ہے"۔

حضرت علی علیہ السلام کی اپنے صحابہ کو وصیت

﴿كَانَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ عَلَيْهِ السَّلَامُ يُوصِي أَصْحَابَهُ يَقُولُ: أُوصِيكُمْ بِالْخَشْيَةِ مِنَ اللّٰهِ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ وَالْعَدْلِ فِي الرِّضَا وَالْغَضَبِ وَالْاِكْتِسَابِ فِي الْفَقْرِ وَالْغِنٰى وَأَنْ تَصِلُوا مَنْ قَطَعَكُمْ وَتَعْفُوا عَمَّنْ ظَلَمَكُمْ وَتُعْطُوا عَلٰى مَنْ حَرَمَكُمْ وَلْيَكُنْ نَظَرُكُمْ عِبَرًا وَصَمْتُكُمْ فِكْرًا وَقَوْلُكُمْ ذِكْرًا وَطَبِيعَتُكُمُ السَّخَاءَ فَإِنَّهُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ بَخِيلٌ وَلَا يَدْخُلُ النَّارَ سَخِيٌّ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۰)

"امام موسیٰ کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے اپنے اصحاب کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا: میں تمہیں سفارش کرتا ہوں کہ خفیہ طور پر اور عیاں طور پر اپنے رب سے ڈرو، غصے اور خوشی دونوں صورتوں میں عدل کا خیال رکھو، ضرورت کے وقت اور بے نیازی کے وقت دونوں حالتوں میں اپنا کام اور دھندہ جاری رکھو، تمہارے خاندان میں جو شخص تم سے اپنے تعلقات منقطع کرے اس سے تعلقات قائم کرو، جو تم پہ ظلم کرے اسے معاف کر دینا، جو تمہیں اپنا مال دینے سے گریز کرے اسے عطا اور بخشش کرو، تمہاری نگاہوں میں عبرت ہونی چاہئے، تمہاری خاموشی میں غور و فکر ہونی چاہئے، تمہارے کلام میں صرف یادِ خدا ہو، تمہاری طبیعت اور عادت میں سخاوت رچی بسی ہو، چونکہ کوئی بخیل جنت میں داخل نہیں ہوگا اور کوئی سخی جہنم میں داخل نہیں ہوگا"[1]

---

[1] اس معیار کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم میں سے ہر کوئی اپنے اپنے گریبان میں جھانکے اور دیکھے کہ ہم شیعہ علیؑ (یعنی علیؑ کا پیروکار) کہلانے کے لئے کتنے فیصد پورا اُترتے ہیں۔ ہمیں چاہئے جناب امیر علیہ السلام کی وصیت پر پورا اُترنے کی کوشش کریں تاکہ (نہج البلاغہ میں فرمانِ جناب امیر علیہ السلام) "کہ ہمارا شیعہ وہ ہیں جنہیں ہم اپنا شیعہ کہیں" کا مصداق بن سکیں۔ (مترجم)

حاکم کا فریضہ

جب بھی کوئی شخص کسی قسم کی حکومت اور سرداری کو پالے تو ہمیشہ اسے اس قوم کی فکر دامن گیر رہنی چاہئے۔ ان کے امور حل کرے، ان کے درمیان عدالت قائم کرے، ان کی فریاد کو ہمدردی سے سنے، ان کی شکایات کا ازالہ کرے، ان کی زندگی کی بنیادی ضروریات فراہم کرے، ان سے ہمدردی کرے۔ حکومت کے منصب کو تکبر اور لوگوں پہ غلبہ و تسلط پانے کا وسیلہ قرار نہ دے، لوگوں کی خدمت کو اپنا شعار بنائے۔ اس نیت کو حسن عمل اور سچی خدمت کے ذریعے

ثبوت فراہم کرے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ایک حاکم کا فریضہ یوں بیان کرتے ہیں:

﴿یَجِبُ عَلَی الْوَالِیْ اَنْ یَکُوْنَ کَالرَّاعِیْ لَا یَغْفِلُ عَنْ رَعِیَّتِہٖ وَ لَا یَتَکَبَّرُ عَلَیْھِمْ﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۴)

''حاکم اور فرمانبروا پر واجب ہے کہ وہ چرواہے اور گڈریا کی طرح کبھی بھی اپنی رعیت کے بارے میں غفلت نہ برتے اور کبھی ان سے تکبر نہ کرے''۔

جس کسی نے بُرائی کی

جو لوگ اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتے ہیں اور دُوسروں کے حقوق پامال کرتے ہیں۔ انہیں یہ جان لینا چاہئے کہ مکافاتِ عمل کا سلسلہ تھم نہیں گیا۔ یقیناً انہیں بھی مصائب و مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا، لہٰذا جو بھی دوسروں کے ساتھ بُرا سلوک کرے گا اس نے گویا اپنی عاقبت خود ہی خراب کی ہے۔ یہ مسئلہ اگر انسان ہمیشہ زندگی بھر یاد رکھے اور اسی منطق سے ہمیشہ کام لے تو یقیناً دوسروں کے ساتھ بُرا سلوک کرنے سے اجتناب کرے گا۔

امام موسیٰ علیہ السلام ابن جعفر علیہ السلام نے اس بات کو بڑے واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

﴿مَنْ اَتٰی اِلٰی اَخِیْہِ مَکْرُوْھًا فَبِنَفْسِہٖ بَدَأَ﴾ (بحارالانور، ج:۷۵،ص:۳۲۳)

''جس نے اپنے مؤمن بھائی کے حق میں برائی کی اس نے گویا (اپنے خلاف) خود ہی ابتداء کی ہے''۔

ہلاکت

ہم صانع (خدا) کے وجود پہ اعتقاد رکھتے ہیں اور اس ذاتِ برحق کے وجود پہ دلیل بھی رکھتے ہیں البتہ ذاتِ خدا کا کھوج لگانا محال اور اس موضوع کے متعلق مکمل تحقیق انسان کی بساط سے باہر ہے۔ انسان اس راہ میں جتنی کوشش کرے گا وہ کبھی مطلوبہ نتیجہ تک نہیں پہنچ پائے گا جس کے نتیجہ میں یا تو اصلاً منکر ہو جائے گا یا پھر غلط عقیدے کا قائل ہو جائے گا جو یقیناً اس کی ہلاکت کا سبب بنے گا۔ اور جو بندہ جاہ و مقام کا طلبگار ہے اور صرف منصب کا خواہاں ہے نہ کہ کسی ذمہ داری کا تو وہ یقیناً ہلاکت کی تاریکی میں جا گرے گا اور جو بندہ تکبر و مباہات اور خود کو بڑا سمجھنے کے مرض میں مبتلا ہو جائے تو اس بُری صفت کے نتائج یقیناً اسے ہلاکت سے دوچار کریں گے۔

امام ہفتم علیہ السلام ان تینوں موضوعات کے بارے میں بیان فرماتے ہیں:

﴿مَنْ تَکَلَّمَ فِی اللّٰہِ ھَلَکَ وَ مَنْ طَلَبَ الرِّئَاسَۃَ ھَلَکَ وَ مَنْ دَخَلَہُ الْعُجْبُ ھَلَکَ۔﴾ (تحف العقول، ص:۴۰۹)

''جو بندہ ذاتِ خدا کے بارے میں گفتگو کرے گا وہ ہلاک ہو جائے گا، جو بندہ سردار و رئیس بننے کا طلبگار رہو گا وہ بھی ہلاک ہو جائے گا اور جو بندہ خودسری کا شکار ہو گا وہ بھی ہلاک ہو جائے گا''۔

دُنیا بھی اور آخرت بھی

بعض افراد کا نظریہ ہے کہ ایماندار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ دنیا سے منہ موڑ لے صرف آخرت کی فکر میں لگا رہے اور دنیا کی نعمتوں اور لذائذ سے چشم پوشی اختیار کر لے، جبکہ اسلام نے انسانوں کو جو لذائذ شرعی طور پر جائز ہیں سے ہرگز منع نہیں فرمایا بلکہ انہیں دینی معاملات کی انجام دہی کیلئے وسیلہ قرار دیا ہے۔

اس بارے میں امام موسیٰ علیہ السلام ابن جعفر علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿اِجْعَلُوْا لِاَنْفُسِکُمْ حَظًّا مِنَ الدُّنْیَا بِاِعْطَائِھَا مَا تَشْتَھِیْ مِنَ الْحَلَالِ وَ مَا لَا یَثْلِمُ الْمُرُوَّۃُ وَ مَا لَا سَرَفَ فِیْہِ وَاسْتَعِیْنُوْا بِذٰلِکَ عَلٰی اُمُوْرِ الدِّیْنِ فَاِنَّہٗ رُوِیَ لَیْسَ مِنَّا مَنْ تَرَکَ دُنْیَاہُ لِدِیْنِہٖ اَوْ تَرَکَ دِیْنَہٗ لِدُنْیَاہُ۔﴾ (تحف العقول، ص:۴۱۰)

''اس دنیا سے اپنا حصہ لے لو اس ترتیب کے ساتھ کہ جتنی تمہاری طبیعت چاہے، بشرطیکہ وہ حلال ہو اور مروت سے منافات بھی نہ رکھتی ہو اور اس میں اسراف بھی نہ ہو اسے اپنی طبیعت کے اختیار میں دے دو اور انہیں شرعی لذائذ سے دینی اُمور کیلئے مدد حاصل کرو چونکہ (ہمارے آبا وَ اجداد سے) روایت ہے کہ:

"جو بندہ اپنے دین کو دنیا کیلئے یا دنیا کو دین کیلئے ترک کر دے وہ ہمارے پیروکاروں میں سے نہیں ہے"۔

اچھی ہمسائیگی

قرآن کریم اور آئمہ اطہار علیہم السلام کے فرامین میں ہمسائے اور ان کے حقوق کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ ان میں من جملہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

"پیغمبر اکرمؐ نے پڑوسی کے متعلق اتنی زیادہ سفارش کی ہے کہ ہم سوچنے لگے کہ کہیں پڑوسی کو میراث میں حصے دار نہ بنا دیا گیا ہو"۔

اس لحاظ سے انسان اپنے پڑوسی کو ہرگز اذیت نہ پہنچائے اور اس کی ناراضگی اور تکلیف دینے کے اسباب ہرگز فراہم نہ کرے اور اگر کوئی بندہ اپنے پڑوسی کو تکلیف پہنچاتا ہے تو اچھا پڑوسی ہونے کے ناطے اسے برداشت کرے۔

امام موسیٰ علیہ السلام ابن جعفر علیہ السلام پڑوسیوں سے سلوک روا رکھنے کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

﴿لَيۡسَ حُسۡنُ الۡجِوَارَ كَفُّ الۡاَذٰى وَلٰكِنۡ حُسۡنُ الۡجِوَارِ الصَّبۡرُ عَليٰ الۡاَذٰى۔﴾ (تحف العقول، ص:۴۰۹)

"اچھا پڑوسی وہ نہیں ہے جو ہمسایوں کو تکلیف نہ پہنچائے بلکہ اچھا پڑوسی وہ ہے جو پڑوسیوں کی طرف سے پہنچنے والی تکالیف کو برداشت کرے"۔

ہمنشینی

دوسروں کی محفل اور مجلس میں بیٹھنے کے انسان پہ گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں تبھی تو ہمارے آئمہ اطہار علیہم السلام نے اس بارے میں حکم دیا ہے کہ انسان کی ہر کس و ناکس سے رفت و آمد نہیں ہونی چاہیئے۔ ہر کسی سے اس کی نشست و برخاست نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ صالح اور نیک افراد کی صحبت اور دوستی اختیار کرے، چونکہ اسی دوست کے سبب ہی مُتدیّن افراد کے ساتھ روابط کے سبب میں خدا کی طرف مڑے گا۔ اس کی توجہ مادیات کی طرف کم ہوتی چلی جائے گی اور مؤمن شخص کا اخلاق اس کی شخصیت پر اثر انداز ہونے لگے گا، آہستہ آہستہ ایماندار بن جائے گا اور یہی ایمان دُنیا و آخرت میں اس کی خوش بختی کیلئے کافی ہوگا۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اس حقیقت کو اس جملے کے ضمن میں بیان فرما رہے ہیں:

﴿مُجَالَسَةُ اَهۡلِ الدِّيۡنِ شَرَفُ الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ۔﴾ (بحارالانوار، ج:۱۷۵، ص:۳۱۲)

"دیندار افراد کی ہمنشینی دُنیا و آخرت دونوں کیلئے باعثِ شرف ہے"۔

یقین

یقین کو عرفان میں بلند و بالا مقام حاصل ہے۔ یقین کا مطلب یہ ہے کہ انسان صمیم قلب سے دینی بنیادوں کا ادراک کرے مثلاً اسے علم ہو وہ جانتا ہو کہ خدا ہے انبیاء علیہم السلام مخلوق کی ہدایت کیلئے مبعوث کئے گئے ہیں۔ آسمانی کتب خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔ قیامت کا دن اور جنت و جہنم کا وجود برحق ہے۔ نیک اور بُرے اعمال والے اپنے اپنے انجام کو ضرور پائیں گے۔ جو بندہ یقین کے مرتبے پہ پہنچ جائے گا وہ کبھی گمراہ نہیں ہوگا، اپنے عقیدے میں سُست روی کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ اس کے سامنے جتنی بھی دلیلیں اور براہین قائم کی جائیں اس کے پایۂ استقلال میں لغزش نہیں آئے گی۔ اس مرحلے پہ زندگی کے جن حالات سے اس کا واسطہ پڑے گا وہ اس کے یقین پہ دلالت کریں گے۔

امام ہفتم سے سوال کیا گیا کہ یقین کیا ہے؟ تو آپؑ نے جواب میں فرمایا:

﴿يَتَوَكَّلُ عَليٰ اللّٰهِ وَيُسَلِّمُ لِلّٰهِ وَيَرۡضٰي بِقَضَآءِ اللّٰهِ وَيُفَوِّضُ اِليٰ اللّٰهِ﴾ (تحف العقول، ص:۴۰۸)

"یقین یہ ہے کہ انسان خدا پہ توکل رکھے، خدا کے سامنے تسلیم ہو جائے، خدا کی قضا و قدر پہ راضی ہو جائے، اپنے معاملات اپنے رب پہ چھوڑ دے"۔

عین و برکت

چند ایسی صفات ہیں جو ایک مسلمان شخص اور آئمہ اطہار علیہم السلام کے پیروکاروں میں ضرور ہونی چاہیئے۔ ان میں سے ایک نرمی ہے یعنی لوگوں سے ہم آہنگی کرے اور ان سے اچھا سلوک کرے، اپنے اندر حلم پیدا کرے اور ان کے ساتھ صبر و تحمل بھری رفتار کرے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ برائیوں میں مددگار بن جائے اور بُرے لوگوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا شروع کر دے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی از منکر کرتے وقت نرم رویہ رکھے، غصے کا اظہار نہ کرے۔ دوسری یہ کہ لوگوں سے حسن سلوک کرے، اس کا اخلاق اچھا اور اسلامی ہونا چاہیئے۔

امام ہفتم علیہ السلام ان صفات کے نتائج کو یہاں بیان فرما رہے ہیں:

﴿عَلَيْكَ بِالرِّفْقِ، فَإِنَّ الرِّفْقَ يُمْنٌ وَالْخُرْقَ شُؤْمٌ إِنَّ الرِفْقَ وَالْبِرَّ وَحُسْنَ الْخَلْقِ يُعَمِّرُ الدِّيَارَ وَ يَزِيْدُ فِيْ الرِّزْقِ۔﴾ (تحف العقول، ص:۳۹۵)

''تمہارے اُوپر ضروری ہے کہ لوگوں کے ساتھ نرمی اور اچھے طریقے سے گفتگو کرو۔ خوشی برکت ہے اور غصہ گھٹیا پن ہے چونکہ نیکی نرم رفتاری اور خوش اخلاقی سے (لوگوں کے درمیان باہمی امداد اور تعاون کو فروغ ملتا ہے) شہر آباد ہوتے ہیں اور رزق و روزی میں اضافہ ہوتا ہے''۔

اختتام ترجمہ:

صرف اس کی عطاء کردہ توفیقات کے ساتھ

التماس دُعا

سید سجاد ھمدانی

(0345-5205984)

28 جون 2007ء

اختتام تطبیق و اصلاح ترجمہ:

21 جولائی 2007ء

بتوفیقہٖ و بعونہٖ تعالیٰ و بتائید معصومین علیہم السلام

محمد لقمان ڈار عفی عنہٗ